سیّد ابو الاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر : خرم مراد

ادارۂ ترجمان القرآن

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر خرم مراد

جلد ۱۲۴ | نومبر ۱۹۹۶ء رجب ۱۴۱۷ | عدد ۱۱

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور - ۵۴۵۷۰

فون: ۷۸۴۴۶۰۵

فیکس: ۷۸۴۲۱۹۴

انتظامی امور

۵-اے، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون: ۷۵۸۷۹۱۶ - ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ - /۱۵ روپے

زر سالانہ - /۱۵۰ روپے

مشرق وسطی - /۵۵۰ روپے

بنگلہ دیش، مسقط - /۴۵۰ روپے

بھارت - /۳۰۰ روپے

یورپ، مشرق بعید - /۶۵۰ روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا - /۹۰۰ روپے

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

۶۰ سال پہلے

'الفرقان' شہید نمبر

بریلی سے مولانا محمد منظور نعمانی تقریباً ڈھائی سال سے ایک عمدہ مذہبی رسالہ ''الفرقان'' کے نام سے شائع کر رہے ہیں جس کا نصب العین بدعات و خرافات کا رد اور عقائد صالحہ کی اشاعت ہے۔ حال میں انھوں نے ایک خاص پرچہ شہید نمبر کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ نمبر مولانا اسماعیل شہید'' کے احوال و سوانح اور ان کی عظیم الشان دینی خدمات کے تذکرے پر مشتمل ہے' اور چونکہ حضرت شہید کی سیرت تمام تر حضرت سید احمد بریلوی'' کی سیرت سے وابستہ ہے' لہٰذا ساتھ ساتھ ان کے حالات بھی آگئے ہیں۔ اسلامی ہند کے دورِ اخیر میں تین شخص ایسے گزرے ہیں جنھوں نے اس ملک میں اسلامی اقتدار کی حفاظت پر اپنی جانیں قربان کیں۔ سب سے پہلے ٹیپو سلطان' اس کے بعد سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل۔ ان تینوں شہیدوں میں سے مقدم الذکر کی خدمات زیادہ تر سیاسی ہیں۔ اور موخر الذکر حضرات نے سیاسی اور مذہبی دونوں حیثیتوں سے وہ خدمات انجام دی ہیں جن کی نظیر بجز سلف صالح کی سیرتوں کے اور کہیں نہیں ملتی۔ مسلمانان ہند کی شامتِ اعمال سے قہرِ الٰہی کی آمد مقدر ہو چکی تھی۔ اس لیے اسلام کے یہ تینوں جاں نثار خادم اپنی کوششوں میں ناکام ہوئے' مگر انھوں نے بہرحال اپنا فرض ادا کر دیا۔ بازی اگرچہ پا نہ سکے سر تو کھو سکے۔ حیف ہے کہ مسلمان اب ان کی جاں نثاریوں کی یاد بھی دل سے بھلا دیں۔

مولانا محمد منظور صاحب شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ہمارے تین قومی شہیدوں میں سے دو کی یاد تازہ کی اور وہ نمو نے ہمارے سامنے پیش کیے جو ان کی یاد کے ساتھ ہمارے ایمان کو بھی تازہ کرنے والے ہیں۔ شہید نمبر کے تمام مضامین اس قابل ہیں کہ ان کو پڑھا جائے اور بار بار پڑھا جائے۔

قیمت قسم اول ۱۰/ار۔ قسم دوم ۷/ر۔ جو حضرات الفرقان کے باقاعدہ خریدار ہونا چاہیں ان کے لیے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ تین روپے بھیج کر ماہ محرم ۵۵ھ سے خریدار بن جائیں۔ اس صورت میں ان کو شہید نمبر کی قیمت علیحدہ نہ دینی پڑے گی۔

(مطبوعات۔ جلد ۹' عدد ۳' رمضان المبارک ۵۵ ۳' نومبر ۱۹۳۶)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

کرپشن کا علاج کیسے

خرم مراد

آج پبلک عہدوں اور اختیارات کے بل پر قومی دولت اور پبلک اموال و املاک کی لوٹ کھسوٹ کا مرض سرطان کے ناسور کی طرح پورے جسد قومی میں پھیل چکا ہے' اور اس کی ہلاکت کے درپے ہے۔ کرپشن کا لفظ انگریزی ہے اور 'فساد' کی طرح 'وسیع معانی رکھتا ہے' لیکن دیکھتے دیکھتے یہ اجنبی لفظ اسی لوٹ کھسوٹ کے معنوں میں زبان زد عام ہوگیا ہے۔

کرپشن کئی صورتوں میں صاف دیکھا جاسکتا ہے۔ کہیں صاحبان منصب بے دریغ قومی مال و املاک غصب کرکے اپنی جائداد بنا رہے ہیں۔ کہیں وہ کروڑوں اربوں کی ملکیتوں کو بے دردی کے ساتھ کوڑیوں کے مول بخش کر اپنے بنک بیلنس بے تحاشا بڑھا رہے ہیں۔ ہرچیز چرائی جارہی ہے' نہروں میں بہنے والا پانی بھی اور نصف کے قریب تک تاروں میں بہنے والی بجلی بھی۔ کہیں سرکاری کنٹریکٹ دینے پر ۴۰ فی صد تک کمیشن طلب کیے جاتے ہیں۔ جو بالآخر قومی خزانے ہی سے آتے ہیں' سرکاری امور حسب دل خواہ نپٹانے کے لیے' اور اکثر قومی خزانے کو نقصان پہنچاکر نپٹانے کے لیے' بڑی بڑی رشوتیں وصول کی جارہی ہیں۔ سرکاری پیسے سے بے دریغ خرچ کرنے اور داد عیش دینے میں کسی قسم کا تامل نہیں۔ آج وزیراعظم ہاؤس اور ایوان صدر کے اخراجات کسی طرح تعلیم و صحت کے بجٹ سے کم نہیں۔ قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند

یہ کوئی ڈھکا چھپا کاروبار نہیں۔ ہر زبان پر اس کرپشن کی مذمت ہے۔ لعنت ملامت کرنے میں سب سے تیز وہ ہیں جو سب سے زیادہ بااختیار مناصب پر فائز ہیں یا رہے ہیں۔ وہی اس ناسور کے علاج کے سب سے زیادہ ذمہ دار بھی ہیں۔ لیکن کرپشن میں کمی ہونے کے بجائے اس میں روزبروز اضافہ ہورہا ہے۔ کوئی موثر قدم اٹھانے کا کیا سوال' ہمارے خیال میں تو اس کاروبار کی ساری رونق اور فروغ ان ہی کے دم قدم سے ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ یہ کچھ آج کے حکمرانوں ہی کا معاملہ نہیں' فوجی آمر رہے ہوں یا منتخب آمر' کسی نے بھی زبانی جمع خرچ سے زیادہ کبھی کچھ نہیں کیا' بلکہ الٹا سیاسی اور اقتصادی کرپشن کو خوب فروغ دیا تاکہ اپنا اقتدار سلامت رہے۔ جب مجرم ہی تفتیش کنندہ ہو' وہی

وکیل ہو، وہی جج، تو اصلاح کیسے ہو۔

حال میں یہ مسئلہ ایک دم توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔ ایک طرف حکومت اور حزب اختلاف نے اپنی محاذ آرائی میں کرپشن کو ایک گیند بنا لیا ہے اور اسے گیند کی طرح خوب اچھالا جا رہا ہے۔ اگرچہ ہماری رائے میں دونوں میں سے کوئی بھی اس بارے میں سنجیدہ نہیں۔ آج کے حکمران کوئی بھی موثر قدم اٹھانے سے انکاری ہیں، سوائے اس بہانے اپنے سیاسی مخالفین کو سیدھا رکھنے کے۔ آج کی حزب اختلاف ان سے بالکل مختلف نہ ثابت ہوگی۔ آپ ہی سوچیے کہ اگر کوئی موثر غیر جانب دار مشینری بن جائے اور جاپان و اٹلی ہی کی طرح سابق وزراے اعظم تک جیل جانے لگیں، تو ان میں سے کون بچے گا۔

دوسری طرف، جناب صدر نے دونوں ایوانوں کے نام اپنے پیغام کے ذریعے کرپشن کے مسئلے کو قومی زندگی کی سرخی بنا دیا ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ ان کا یہ پیغام ایک ایسے کک سے زیادہ کام نہ کرے گا جو گیند اور اوپر اچھال دے، مگر گول نہ کر سکے۔ ریفری گول کیسے کرے، خصوصاً جب کہ اس کی کوئی ٹیم نہ ہو۔ ہمیں ان کی نیک نیتی میں کوئی شک نہیں، لیکن ان کے اقدام کے نتیجے میں سیاسی سیٹ اپ بدلنے کی راہ تو ہموار ہو سکتی ہے، کرپشن پر قابو پانا محال ہے۔

ہم یہ بات کسی مایوسی کی بنیاد پر نہیں کر رہے، نہ مایوسی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم تو صرف سنتِ الٰہی بیان کر رہے ہیں تاکہ حقیقت کا صحیح ادراک ہو، اور جتنا کچھ علاج، جس طرح، کرنا ممکن ہو، اس کے لیے قوم عملی تدابیر اختیار کرے۔ سنت الٰہی یہی ہے کہ جو لوگ خود اصلاح کرنا نہ چاہیں، بدی پر قائم رہنا چاہیں، اسے ختم کرنا نہ چاہیں، کوئی غیبی قوت، کوئی نیک خواہش اور کوئی وعظ ایسا نہیں جو ان کو بہ زور اصلاح کے راستے پر ڈال دے، نیک بنا دے، اور برائی کو ختم کر دے۔ ارباب قیادت سے خطاب و تنبیہہ تو اس لیے ضروری ہے کہ ان کے اور قوم کے سامنے ان کی صحیح تصویر آجائے۔ ورنہ اختیارات کا سرچشمہ تو قوم ہے۔ اور ہمارے خیال میں، اس وقت حکومت اور حزب اختلاف کی باہمی محاذ آرائی اور صدر کے رول نے ایک ساز گار صورت حال پیدا کر دی ہے۔ اس ساز گار صورت حال میں ضروری ہے کہ دانش مند اور دین پسند قیادت قوم کو کھڑا کرے اور اس کا وزن اور آواز اس ناسور کے علاج کے لیے موزوں اور موثر اقدامات کے نفاذ کے حق میں ڈالے۔ بہت کچھ فوراً نہ بھی ہو سکے، تو ہمیں یقین ہے کہ اس وقت کم سے کم چند موثر اور معقول تدابیر قانون کا جامہ ضرور پہن سکتی ہیں۔ ایسے ادارے بھی وجود میں آسکتے ہیں جو آج نہیں تو کل موثر ثابت ہوں۔ اور شاید کچھ ایسے اقدامات بھی اٹھائے جا سکیں جو اصلاح کا راستہ کھول دیں۔

۱۔ ان تدابیر میں سب سے ضروری تو ایک اعلیٰ اور با اختیار احتسابی عدالت کا قیام ہے' جیسا کہ ان صفحات (اگست ۹۶) میں تجویز کیا جا چکا ہے۔ یہ کام کرانا بھی آسان نہ ہوگا' لیکن اس وقت فضا ایسی ہے کہ یہ ناممکن بھی نہیں۔ اس عدالت کو موثر ہونے کے لیے سپریم کورٹ کی طرح با اختیار ہونا چاہیے' اگرچہ اس کے فیصلوں کے خلاف ایک اپیل کا حق ضرور ہو۔ اسے شہریوں کی طرف سے درخواست پر یا از خود (سوموٹو) بھی کارروائی کا اختیار ہونا چاہیے۔ سپریم کورٹ کی ایک مستقل خصوصی بنچ بھی یہ رول ادا کر سکتی ہے' لیکن نفسیاتی اثر و تاثیر کے لیے ایک علیحدہ عدالت ہی ضروری ہے۔ عدالتی طریق کار میں تاخیری حربوں کے ازالے کا بندوبست بھی ہونا چاہیے' اور مختلف کارروائیوں کی تکمیل کے لیے مدت کا تعین بھی۔

۲۔ عدالت کے ساتھ ایک آزاد اور با اختیار محاسب یا پبلک پراسیکیوٹر کا ادارہ بھی ضروری ہے' جو تفتیش بھی کرے اور مقدمات بھی چلائے۔ ہر دستاویز' گواہ اور معلومات حاصل کرنے کا اسے اختیار ہونا چاہیے۔ اگر ایسا با اختیار ادارہ مناسب تفتیش شروع کر دے تو بہت سے مجرم عدالت سے پہلے ہی حوصلہ ہار بیٹھیں گے۔

لیکن صرف عدالت اور احتسابی عدالت کا قیام کافی نہ ہوگا۔ قانون میں چند ایسی دفعات کا اضافہ ضروری ہے' جو قرآن مجید اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام اور خلفائے راشدین کی روایات سے ثابت ہیں۔ ان کو ماننے میں کسی مسلمان کو تامل نہ ہونا چاہیے۔

۳۔ قومی دولت کو لوٹنے کی یہ سزا بالکل ناکافی اور غیر مناسب ہے کہ صرف مجرم کو نااہل قرار دے دیا جائے' اسے ریٹائر کر دیا جائے' یا چند سال کے لیے جیل میں ڈال دیا جائے تاکہ جب وہاں سے نکلے تو اپنی لوٹ مار کے مال سے داد عیش دے۔ نہیں' جو قومی اموال اس نے غصب کیے ہوں یا ناجائز حاصل کیے ہوں وہ ضبط کرنے کا قانون بننا ناگزیر ہے' اگر احتسابی عمل کو موثر ہونا ہے۔ نبی کریمؐ سے یہی ثابت ہے۔

حضورؐ نے ابن اللتبیہ نامی ایک شخص کو تحصیل دار مقرر فرمایا۔ وہ زکوٰۃ جمع کر کے لائے اور اسے جمع کراتے ہوئے کہا کہ یہ آپ کے لیے ہے اور یہ (باقی) مجھے تحفے دیے گئے ہیں۔ آپؐ نے ان تحائف کو ضبط کر لیا۔ [حالانکہ نہ یہ اسے کوئی رعایت دینے کے صلے میں ملا تھا' نہ کسی کا حق دینے کے صلے میں۔ گویا یہ کسی طرح رشوت کی تعریف میں نہ آتا تھا]۔ پھر آپ کھڑے ہوئے اور خطبہ ارشاد فرمایا: میں تم میں سے بعض لوگوں کو ان امور کی انجام دہی کے لیے مقرر کرتا ہوں جن پر اللہ تعالیٰ نے مجھے حاکم مقرر کیا ہے۔ پھر ایک آدمی آتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ بیت المال کا مال ہے' اور یہ مجھے ہدیہ دیا

گیا ہے۔ بھلا یہ شخص اپنے والدین کے گھر کیوں نہ بیٹھا رہا' پھر وہ دیکھتا کہ اسے تحائف دیے جاتے یا نہیں۔ آخر میں آپؐ نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے یہاں تک کہ ہم نے آپؐ کی بغلوں کی سفیدی دیکھی 'پھر فرمایا: اے اللہ 'کیا میں نے تیرا حکم پہنچا دیا؟ اے اللہ میں نے تیرا حکم پہنچا دیا! (بخاری ' مسلم)

حضرت عمرؓ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنے مقرر کردہ گورنروں اور عہدے داروں سے ان کے تقرر کے وقت ان کے اثاثہ جات کی تفصیل طلب کرتے اور اسے ریکارڈ میں رکھتے۔ پھر وقتاً فوقتاً ان کے اموال کا جائزہ لیتے رہتے۔ حج کے موقع پر تو مسلمانوں کی بین الاقوامی جنرل اسمبلی میں وہ حاضر ہونے کے پابند تھے ' جہاں ان کے خلاف ہر شکایت کی دادرسی کی جاتی۔ کوئی بھی شکایت آتی کہ کسی گورنر نے وسائل سے زیادہ دولت جمع کر لی ہے تو اس کی بھی تحقیق کرتے۔ اور جن کے بارے میں یہ ثابت ہو جاتا کہ ان کے پاس اپنے وسائل سے زیادہ دولت ہے ' ان کو اپنی دولت کی توجیہ کرنے کا حکم دیتے۔ جو توجیہ نہ کر پاتا ' اس کی املاک کا نصف ضبط کر کے بیت المال میں داخل فرما دیتے۔ ایک دفعہ ایک شاعر نے اپنے اشعار کے ذریعے نو عہدے داروں کی دولت کی طرف اشارہ کیا۔ حجاج ' جوزی ' بشر ' نافع ' نافع ' غلاب ' عاصم ' شبل اور ابن عرش۔ آپ نے ان سب کے خلاف تحقیق کر کے کارروائی فرمائی۔ (فتوح البلدان ، الفاروق)

آج ہمارے ہاں کوئی بڑا جاگیردار ہو ' افسر ہو یا جنرل ہو ' پولیس انسپکٹر یا کسٹم آفیسر ہو --- ان کی دولت کا ان کی آمدنی سے موازنہ کرنا مشکل تو ہو سکتا ہے مگر ناممکن نہ ہو گا۔ لیکن حرام کمائی ضبط کیے بغیر بدعنوانیوں ' رشوت خوری اور لوٹ مار کا تدارک کسی طرح بھی ممکن نہیں۔

۴۔ اثاثہ جات کے اعلان (declaration of assets) کا اصول بھی حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے مقرر کیا ' اور اس کو نافذ بھی کیا۔ ہر عہدے دار کے لیے یہ اعلان کرنا لازم ہونا چاہیے۔ اس اعلان کو علانیہ بھی ہونا چاہیے اور اسے ہر شہری کو دستیاب بھی ہونا چاہیے۔ اس اعلان کے مطابق مختلف اوقات میں اس کے اثاثوں کا جائزہ لینا بھی ضروری ہونا چاہیے۔ اور جن اثاثوں پر ملکیت نہ ظاہر کی گئی ہو ' یا جو بقدر آمدنی نہ ہوں ' وہ قابل ضبطی ہونا چاہیں۔ اثاثوں کو بے نامی چھپانے کا تدارک بھی ضروری ہو گا۔

۵۔ مالی بدعنوانیوں اور رشوت کا گہرا تعلق مسرفانہ اور پر تعیش طرز زندگی سے ہے۔ سرکاری کاموں کی انجام دہی کے سلسلے میں ' ذاتی زندگی میں بھی۔ اسی لیے حضرت عمرؓ جس کو گورنر مقرر کرتے اس سے سب کے سامنے عہد لیتے کہ وہ (۱) ترکی گھوڑے پر سواری نہیں کرے گا ' (۲) ململ اور مہین کپڑے نہیں پہنے گا ' (۳) چھنا ہوا آٹا نہیں کھائے گا ' (۴) دروازے پر چوکیدار نہیں رکھے گا '

(۵) اپنا دروازہ ہر حاجت مند اور فریادی کے لیے کھلا رکھے گا۔ ذاتی زندگیوں میں اس کا ازالہ تو تذکیر و ترغیب اور چند قانونی پابندیوں سے ہی ہو سکتا ہے' اور ان کو کرپشن کے ازالے کے لیے پیکج کا حصہ بنانا قرین حکمت نہیں۔ لیکن سرکاری دائرے میں جو اصلاحات جائزہ واحتساب کے نظام کے بغیر بہ آسانی ہو سکتی ہیں' وہ قانوناً کرنا چاہییں۔ ہمارے علم میں ہے کہ بے شمار وزرا کے ٹیلیفون بل لاکھوں کے آتے ہیں۔ یہی حال پٹرول کے خرچ اور دفاتر و رہایش کی آرائش و زیبایش کے مصارف کا ہے۔ ان پر بھی معقول پابندیاں لگ سکتی ہیں۔

عام طور پر باقی لباس' رہایش' سفر' اور دوروں پر اخراجات میں کمی کسی قانون سے نہیں ہو سکتی لیکن قوم کے منتخب اور کرپشن کے خاتمے کے دعوے دار حکمران اگر سادگی کے معیارات قائم کریں تو نچلے درجے کے عہدے دار بلکہ عوام الناس بھی ان کی پیروی کریں گے۔ النّاس علیٰ دِین ملوکھم۔

بھارت سے ہماری دشمنی اور رقابت ہے۔ ہماری آبادیاں ایک ہی قسم کے معاشرتی' سیاسی اور اقتصادی پس منظر سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ کافر بھی ہیں اور آخرت کی جواب دہی پر یقین کے دعوے دار بھی نہیں۔ وہ ہم سے کئی گنا زیادہ بڑا طاقتور اور مال دار ملک ہے۔ تصویروں میں اس کی کابینہ کے وزرا کے لباس' فرنیچر اور وضع قطع کی سادگی دیکھ کر رشک و حسرت سے دل بھر آتا ہے۔ انگلستان میں کسی وزیر کی بیوی سرکاری گاڑی استعمال کرتی نہیں کہ اس کے پاس بل آجاتا ہے۔ بعض ممبران پارلیمنٹ نے مخصوص سوالات پوچھنے کے لیے پیسے لے لیے' ان کا شدید احتساب ہو گیا' نیا قانون بن گیا جس میں اس کو قابل سزا قرار دے دیا گیا۔ یہاں جب مالی بدعنوانیوں کے الزامات لگتے ہیں' خاص طور پر ذاتی دائرے میں' اور ہم ان رقموں پر نظر ڈالتے ہیں جن کی خاطر لوگ بدنام بھی ہوتے ہیں اور عہدوں سے دست بردار بھی' تو حیرت ہوتی ہے۔ یہ ہمارے ہاں کے لاکھوں کروڑوں کی لوٹ کھسوٹ کا کیا مقابلہ کریں گے۔

اسی لیے ایسے قانون یقیناً ضروری ہیں جو کرپشن کے ازالے کے لیے درکار ہوں' احتسابی مشینری بھی ناگزیر ہے' سزائیں لازمی ہیں ---- لیکن یہ سب چیزیں کبھی کافی نہیں ہو سکتیں جب تک ضمیر اور اخلاقی احساس زندہ نہ کیا جائے' حرام اور حلال کا احساس مضبوط نہ ہو' اور حرام سے بچنے کی فکر نہ ہو۔ مسلمان کو یہ غذا کہیں سے نہیں مل سکتی سوائے اللہ سے ملاقات اور وہاں اپنے اعمال کی جواب دہی پر یقین کے سرچشمے سے۔ اسی لیے اگرچہ حضورؐ نے وہ مال بھی ضبط کر لیا جو فرائض کی ٹھیک ٹھیک اہتمام ہونے کے باوجود بربنائے عہدہ ملا تھا' حضرت عمرؓ نے بھی پبلک عہدے داروں پر پابندیاں عائد کر رکھی تھیں' ان کا احتساب کرتے تھے اور انھیں سزائیں دیتے تھے ---- یہ سب ضروری تھا' اور

صرف تذکیر اور ضمیر پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا--- لیکن در اصل اسلام نے ہر انسان کے دل میں جواب دہی کا احساس، احتساب کا اندیشہ اور اخروی سزاؤں کا خوف بٹھانے کو اولین ترجیح دی ہے ---اور یہی سب سے زیادہ کارگر تھا۔ اگر تمام تدابیر کے ساتھ ہم نے یہ نسخہ بھی اختیار کیا تب ہی ہم بڑی حد تک اس مرض پر قابو پا سکیں گے جس کی جڑیں انسان کی طبیعت میں بڑی گہری اتری ہوئی ہیں، اور جس کے بارے میں بعض بہترین تربیت یافتہ افراد بھی الزامات، فتنوں میں پڑنے اور سزاؤں کا مستحق بننے سے نہ بچ سکے۔

جب حضورؐ نے ایک تحصیل دار کو دیے گئے تحائف ضبط فرمائے، تو بڑا بلیغ جملہ ارشاد فرمایا کہ "بھلا یہ گھر بیٹھا رہ کر تو دیکھے کہ اسے کتنے تحائف ملتے ہیں۔" اسی وقت آپ نے اپنے خطبے میں تذکیر بھی فرمائی۔ "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، جو کوئی کوئی بھی چیز لے گا، وہ اسے اپنی گردن پر لادے قیامت کے دن آئے گا۔ اونٹ ہو گا تو وہ بلبلاتا ہو گا، گائے ہو گی تو ڈکراتی ہو گی، بکری ہو گی تو ممیاتی ہو گی"۔

زکوٰۃ کے بعد پبلک اموال کا دوسرا بڑا ذریعہ مال غنیمت تھا۔ زکوٰۃ کا تو حساب کتاب ہوتا تھا مگر جنگ میں تو مال غنیمت بے حساب ہوتا تھا اور اس پر قبضہ کر لینا بہت عام بات تھی۔ اس لیے اس بارے میں حضورؐ نے تعلیم و تربیت کا زبردست اہتمام فرمایا۔

ایک دفعہ آپؐ خطبہ دینے کھڑے ہوئے، غنیمت میں خیانت کو اور اس کام کو بہت بڑا گناہ بتایا، پھر فرمایا: "میں کسی سے اس حالت میں نہ ملوں کہ وہ قیامت کے دن آئے اور اس کی گردن پر اونٹ بلبلاتا ہو۔ وہ کہے یا رسول اللہ، میری مدد کیجیے، اور میں کہوں تیری کوئی مدد نہیں کر سکتا، میں نے تجھے اللہ کا حکم پہنچا دیا تھا---

[اسی طرح کسی کی گردن پر گھوڑا ہنہناتا ہو گا، کسی کی گردن پر بکری ممیاتی ہو گی، کسی کی گردن پر آدمی سوار چیخ رہا ہو گا اور کسی کی گردن سے کپڑے کا تھان لپٹا ہو گا--- ان میں سے ہر ایک کہے گا، یا رسول اللہ، میری مدد کیجیے۔ ہر ایک سے میں یہی کہوں گا، اب میں تیری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ میں نے تجھے اللہ کا حکم بتا دیا تھا] (بخاری و مسلم)

ذرا تصور کیجیے! ان سب چیزوں کو گردن پر اٹھانا تو پھر کچھ ممکن لگتا ہے۔ آج کے ان لوگوں کا کتنا برا حال ہو گا جو اپنی گردنوں پر محل نما مکانات، ہزاروں گز کے پلاٹ، کارخانے، عالی شان پوں پوں کرتی کاریں، زیورات اور سوئس بنک اکاؤنٹوں کے سونے چاندی کے دہکتے ڈھیر لادے ہوئے آئیں گے اور رسول اللہؐ ان کی مدد کرنے سے انکار کر دیں گے۔

آپؐ نے یہ عمومی اصول بیان فرمایا کہ "جو لوگ اللہ کے مال میں [اور مسلمانوں کا ہر مال، اللہ

کا مال ہے] بغیر حق کے تصرف کرتے ہیں ' ان کے لیے قیامت کے دن آگ ہے" (بخاری)۔ پھر آپ نے مختلف مواقع پر اس کی جو تفصیل بیان فرمائی ' وہ دیکھی جائے تو مال کے بارے میں ان لوگوں کی ذکاوت حس پر کسی تعجب کی گنجایش نہیں رہ جاتی۔ حضورؐ کا ایک غلام مدعم کجاوا اتار رہا تھا کہ اسے ایک تیر لگا اور وہ مر گیا۔ لوگوں نے کہا ' اس کو جنت مبارک ہو۔ آپؐ نے فرمایا" ہرگز نہیں ' اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے ' وہ چادر جو اس نے خیبر کے دن مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے لے لی تھی ' اس پر آگ بن کر شعلہ مار رہی ہے" (بخاری، مسلم)۔ حضورؐ کے سامان پر کرکرہ نامی ایک شخص مامور تھا۔ وہ مر گیا تو آپؐ نے فرمایا ' وہ دوزخ میں ہے۔ لوگ گئے تو دیکھا کہ اس نے مال غنیمت میں سے ایک کملی چھپالی تھی ' (بخاری)۔

پھر آپؐ نے خیانت کے جرم پر پردہ ڈالنے والے کو بھی یہی وعید سنائی: "جو شخص خیانت کرنے والے کی حرکت کو چھپائے گا ' وہ اسی کی طرح (سزا کا مستحق) ہو گا" (ابو داؤد)۔ پھر جو لوگ اعانت کریں ' ان کا کیا بنے گا! اور وہ لوگ جو خائنوں کی طرف داری کریں! اس طرف داری سے ' ایک دوسرے بیان میں ' اللہ تعالیٰ نے سختی سے روکا ہے۔ وَلَاتَکُنْ لِلْخَآئِنِیْنَ خَصِیْمًا ۔ تم بددیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والے نہ بنو۔ (النساء ۴: ۱۰۵)

اس ذکاوتِ حِس کا نتیجہ تھا کہ لوگ اَموال مسلمین کی ذمہ داری اٹھانے سے بھاگتے تھے۔ ایک دفعہ حضورؐ نے خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: لوگو ' تم میں سے کوئی ہمارے کسی کام کا ذمہ دار بنایا جائے ' پھر وہ ایک سوئی یا اس سے بھی کم ہم سے چھپالے تو وہ خائن ہے ' اور اسے لے کر قیامت کے دن حاضر ہو گا۔ ایک انصاری کھڑے ہوگئے اور کہا ' یارسول اللہ ' مجھ سے یہ اپنی ذمہ داری واپس لے لیں۔ آپؐ نے فرمایا ' کیوں تمھیں کیا ہوا؟ انھوں نے کہا: میں نے آپؐ کو یہ کہتے سنا ہے! فرمایا: ہاں میں اب بھی کہتا ہوں۔ (مسلم، ابو داؤد)

حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کے بیت المال (public treasury) کو مال یتیم قرار دیا۔ یہ ایک ایسی برمحل ' اچھوتی و نادر اور جامع تشبیہ ہے کہ یہ اس وقت سے مسلمانوں کی روایات ' پالیسی ' نفسیات اور کردار کی بنیاد بن گئی۔ یتیموں کی طرح ' مال کی پبلک بھی بے سہارا اور محتاج ہوتی ہے اور خود اپنے مال کی دیکھ بھال سے قاصر۔ جس کے ہاتھوں میں یہ مال دیا گیا ہے اس کے لیے اپنی ضرورت سے زیادہ اس مال میں سے لینا جائز نہیں '، اور اگر ضرورت مند نہیں ' تو اجتناب بہتر ہے۔ وہ اسے اَللّوں تللّوں میں اڑا نہیں سکتا۔ اس کا فرض ہے کہ اس مال سے یتیموں کی کفالت اور پرورش کرے ' اس کی حفاظت و افزایش کرے اور اسے یتیموں کی طرف ہی لوٹا دے۔ اگر سوچ اور کردار ایسا ہو کہ قومی دولت اور پبلک اموال کو مال یتیم ہی سمجھ کر معاملہ شروع کر دے ' تو بدعنوانی ' لوٹ مار اور

اسراف و تبذیر کی ساری برائیوں پر قابو پایا جاسکتا ہے ۔ جب ایسے خلفا آئے جنھوں نے بیت المال کو اپنی ذاتی جائداد سمجھ کر اپنے اوپر بھی خرچ کیا اور داد و دہش بھی کی تو سلف نے ہمیشہ یہی کہہ کر ان پر نکیر کی : یہ مسلمانوں کا مال ہے ' تم ان کی مرضی کے بغیر اس کو خرچ کرنے کا کوئی اختیار نہیں رکھتے ۔ جو پبلک اموال کو مال یتیم سمجھتا ہو وہ اس بارے میں احکام الٰہی سے غافل نہیں ہو سکتا : ایسا کبھی نہ کرنا کہ حد انصاف سے تجاوز کر کے اس خوف سے ان کے مال جلدی جلدی کھا جاؤ کہ وہ بڑے ہو کر اپنے حق کا مطالبہ کریں گے ۔۔۔ جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کے مال کھاتے ہیں در حقیقت وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے (النساء ۴: ۶ تا ۱۰)

آخرت کی جواب دہی پر یقین سے ہی وہ احساس دیانت اور کردار امانت جنم لیتا ہے جو ایک پایدار اور عالی شان تہذیب اسلامی کی بنیاد رکھ سکتا ہے ۔ کسی نہ کسی درجے میں یہی یقین اور احساس دیانت و امانت حاصل ہو تو ہماری قوم کا یہ سنگین بحران قابو میں آنے کا امکان روشن ہے ۔

ہمیں امید ہے کہ قوم اس سازگار موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک طرف ایسے قوانین اور ادارے بنوانے میں کامیاب ہو جائے گی جو آج بھی اور کل بھی کرپشن کے ازالے کے لیے مناسب اقدامات کرنے کا دروازہ کھول دیں ۔ دوسری طرف ہم اس سے بھی غافل نہ ہوں گے کہ انسان کے اس سب سے دیرینہ مرض کا علاج اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہم اس ایمان اور ان اقدار کو دلوں میں بسانے اور زندگی میں سمونے کی بھرپور کوشش کریں جس کی بنیاد پر قرآن اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری اجتماعیت ' تہذیب اور شخصیت کی بنیاد رکھی ہے ۔

اسلامی ذہنیت

قرآن ہم کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْعَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِالْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ۔ "تم انصاف پر قائم رہو اور خدا کے لیے شہادت دو خواہ وہ تمہاری اپنی ذلت یا تمہارے ماں باپ یا رشتہ داروں ہی کے خلاف کیوں نہ پڑے" (النسا' ۴: ۱۳۵) وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْکَانَ ذَا قُرْبٰی۔ "اور جب بولو تو انصاف ہی کے ساتھ بولو خواہ وہ تمہارے عزیز قریب ہی کے خلاف کیوں نہ ہو" (انعام ۶: ۱۵۲) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو یہ تعلیم دی ہے کہ محبت اور بغض اور تائید اور مخالفت جو کچھ بھی ہو خالص حق کے لیے ہو۔ اوثق عری الایمان الحب فی اللہ و البغض فی اللہ۔ من احب للہ و ابغض للہ و اعطی للہ و منع للہ ونصح اللہ فقد استکمل الایمان۔ الدین النصیحة اللہ عز وجل۔ مسلمان کے لیے صرف ایک ہی پارٹی کافی ہے اور وہ اللہ کی پارٹی ہے۔ اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ اس پارٹی کا اصل اصول یہ ہے کہ تمہاری موافقت اور مخالفت 'تائید اور تردید' دوستی اور جنگ 'اتحاد اور اختلاف ہر چیز نفسانیت سے پاک اور اشخاص یا جماعتوں کی الفت و عداوت سے قطعاً مُبرّا ہو۔ خدا کے دیے ہوئے علم اور اس کی بخشی ہوئی فکر و نظر کو ان تمام رنگین عینکوں سے پاک رکھو۔ جو بات حق پاؤ اسے بے تامل قبول کرو۔ جو غلط دیکھو اسے بے تکلف رد کر دو۔ جو سیدھے رستے پر جا رہا ہو اس کا ساتھ دو۔ جو غلطی کا مرتکب ہو' بے لاگ انصاف کے ساتھ اس کو خطاوار ٹھیراؤ اور راہِ راست پر لانے کی کوشش کرو۔ جس کی موافقت کرو صرف اس حد تک کرو جس حد تک وہ حق اور صداقت پر ہو۔ اور جس سے اختلاف کرو صرف اسی حد تک کرو جس حد تک وہ غلطی پر ہو۔

یہی اسلامی ذہنیت تھی جس نے سید البشر سے کہلوایا تھا کہ والذی نفسی بیدہ لو ان فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت یدھا۔ "خدا کی قسم اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔" اسی ذہنیت نے افضل البشر بعد الانبیا سے کہلوایا تھا کہ فاذا رائیتمونی قد استقمت فاتبعونی و ان زغت فقومونی۔ "جب تم دیکھو کہ میں سیدھا چل رہا ہوں تو میری پیروی کرو اور جب میں ٹیڑھا

چلنے لگوں تو مجھے سیدھا کر دو۔" یہی ذہنیت تھی جس کے اثر سے ایک نکٹی چپٹی عورت نے امیرالمومنین عمرفاروق ؓ کو بھرے مجمع میں مقدار مہر کی تعین پر ٹوک دیا کہ ما ذالک لک (تم کو ایسا کرنے کا حق نہیں)' اور پھر یہی وہ اسلامی ذہنیت تھی جس کی برکت سے پورے مجمع میں سے کوئی ایک نظر بھی اس ہیچ میرز عورت کی طرف تعجب اور تضحیک کے ساتھ نہ اٹھی' اور کسی نے پلٹ کر نہ دیکھا کہ دنیائے اسلام کی سب سے بڑی مایہ ناز ہستی کے مقابلے میں یہ "پیرو مرشد" بننے کی جرات کس شامت زدہ نے کی ہے' اور کسی نے یہ گمان نہ کیا کہ یہ حقیر ہستی اپنے سے لاکھ درجہ بالاتر شخصیت کو ٹوک کر نام وری حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ہوا صرف اتنا کہ فاروق اعظم ؓ نے اس سے دلیل پوچھی' اور جب اس نے اپنی تائید میں نص قرآنی پیش کر دی' تو اس شخص کو جو عرب و شام و فارس کا مطلق العنان بادشاہ' اور تمام اہل ایمان کا امیر' اور علوم شریعت کا امام تھا' ایک ادنیٰ عورت کے مقابلے میں اپنی خطا کا اقرار کرتے ہوئے ذرا جھجک محسوس نہ ہوئی' اور نہ کسی بے عزتی کا احساس ہوا۔ کیونکہ وہ جاہلیت کی عزت نہ تھی' اسلام کی عزت تھی' جس کو کسی کی نصیحت سے ٹھیس نہیں لگ سکتی اور جو اقرار و خطا اور رجوع الی الصواب سے گھٹتی نہیں بلکہ اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

ہر وہ شخص جس کو دین و ملت کی حقیقی خدمت کرنی ہو اس کے لیے لازم ہے کہ اپنے اندر یہی اسلامی ذہنیت پیدا کرے۔ اس کو کسی پارٹی اور کسی گروہ کے ساتھ ایسا معاہدہ نہ کرنا چاہیے کہ ہر خطا و صواب اور ہر صعب و سہل میں اس کی موافقت کرے گا' اور نہ کسی کے خلاف یہ عہد کرنا چاہیے کہ تمام امور میں اس کی مخالفت کرے گا۔ اس کو قوّام بالقسط اور شہید للہ ہونا چاہیے۔ اس کو اوثق عروی الایمان پر قائم ہونا چاہیے۔ اس کا عدل بے لاگ ہونا چاہیے۔ اس کی حق پرستی پارٹیوں اور اشخاص کی محبت و عداوت سے بالکل پاک ہونی چاہیے۔ وہ صرف حزب اللہ کا ممبر بن کر رہے۔ ہر صحیح کی موافقت کرے خواہ وہ کسی کی طرف سے پیش ہو۔ اور ہر غلط کی مخالفت کرے بلالحاظ اس کے کہ اس کا پیش کرنے والا کون ہے۔ جس حد تک کوئی شخص یا جماعت حق پر ہو وہ بھی اس کے ساتھ رہے اور جہاں کوئی راہ راست سے ہٹے وہ نہ صرف اس سے الگ ہو جائے' بلکہ اس کو حق کی طرف کھینچ لانے میں نصیحت کا پورا پورا حق ادا کر دے۔ مگر مخالفت ہو یا موافقت دونوں میں اسے ٹھیک عدل اور حق پرستی کو ملحوظ رکھنا چاہیے تاکہ وہ خود کہیں ظالمین میں شامل نہ ہو جائے

ایسے شخص کی پوزیشن کو وہ لوگ نہیں سمجھ سکتے جو طائفی عصبیت اور فرقہ بندی کی محدود فضا میں رہتے ہیں۔ ان کے لیے یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ دشمنی' حسد' بدخواہی اور نفرت و غضب کے جذبات سے پاک رہ کر بھی کسی کی مخالفت کی جا سکتی ہے اور محبت' عقیدت' ارادت' رشتہ داری اور تمام قریب ترین قلبی تعلقات کو قائم رکھتے ہوئے بھی کسی کی خطا پر تنبیہ کی جا سکتی ہے۔ وہ اپنی غلط ذہنی

تربیت کی بنا پر اس طرز عمل سے قریب قریب بالکل نامانوس ہو چکے ہیں۔ اس لیے وہ اسے غلط سمجھنے اور بری نگاہ سے دیکھنے پر مجبور ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ جس اختلاف کو رحمت سے تعبیر کیا گیا ہے وہ اسی قسم کا اختلاف ہے کیونکہ سوسائٹی کی علمی ترقی' اخلاقی طہارت' اور درستی معاملات کا انحصار تمام تر ایسے ہی اختلاف پر ہے۔ جس قوم کے سرداروں میں فان زغت فقومونی کہنے والے نہ رہیں اور جس قوم کے افراد میں یہ اسپرٹ نہ رہے کہ خلوص نیت کے ساتھ ٹیڑھا چلنے والوں کو سیدھا کر دیں' وہ قوم کبھی درست نہیں رہ سکتی۔

ماءٍ واحدٍ

ایک ہی پانی

اور دیکھو!

زمین میں الگ الگ خطے پائے جاتے ہیں '

جو ایک دوسرے سے متصل واقع ہیں ۔

انگور کے باغ ہیں 'کھیتیاں ہیں '

کھجور کے درخت ہیں 'جن میں کچھ اکہرے اور کچھ دوہرے ۔

سب کو ایک ہی پانی سیراب کرتا ہے

مگر ہم مزے میں کسی کو بہتر بنا دیتے ہیں اور کسی کو کمتر ۔

ان سب چیزوں میں بہت سی نشانیاں ہیں ،

ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں ۔

(الرعد ۱۳ : ٤)

(خیر خواہ)

کلام نبویؐ کی صحبت میں

خرم مراد

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
اللہ تعالیٰ سے شرم حیا کرو، جس طرح اس سے شرم وحیا کرنے کا حق ہے۔
ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ اللہ کا شکر ہے کہ ہم اللہ سے شرم وحیا کرتے ہیں۔
حضورؐ نے فرمایا: اس طرح نہیں، اللہ سے ٹھیک ٹھیک شرم حیا کرنے کا مطلب یہ کہ: تم اپنے سراور سرمیں آنے والے خیالات کی نگرانی کرتے رہو، (کہ برائی کے خیالات داخل نہ ہونے پائیں، اور ہو جائیں تو ٹھہرنے نہ پائیں)۔
اور، تم اپنے پیٹ اور جو پیٹ کے اندر جائے اس کی دیکھ بھال کرتے رہو (کہ حرام غذا اندر نہ جائے)۔
اور، موت کو اور موت کے بعد سڑگل جانے اور فنا ہو جانے کو یاد رکھو۔
اور (یاد رکھو) جو آخرت کا طالب ہوتا ہے، وہ دنیا کی زینت و آرائش کو ترک کر دیتا ہے مگر ہر حال میں آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتا ہے۔
جو شخص یہ سب کچھ کرتا ہے، وہ اللہ سے ٹھیک ٹھیک شرماتا ہے۔ (ترمذی، احمد، بحوالہ مشکوۃ، باب تمنی الموت)

شرم حیا ہماری فطرت میں ودیعت کی گئی ہے۔ جو چیز چھپی ہونا چاہیے وہ دوسروں کے سامنے کھل جائے، فوراً چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، پسینے آنے لگتے ہیں، نگاہ جھک جاتی ہے، منہ چھپا لیتے ہیں، بس نہیں چلتا کس طرح زمین میں گڑ جائیں۔
اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز چھپی نہیں، نہ چھپ سکتی ہے۔ ہر چیز اسی کی دی ہوئی ہے۔ موت کے بعد اس سے ملاقات بھی یقینی ہے۔ اس لیے کوئی بھی غلط کام ہو، کوئی بھی گناہ ہو، اس پر آدمی کو ایسی ہی شرم اللہ سے آنا چاہیے۔ اس شرم حیا کا حق ہے کہ وہ ان چیزوں میں پڑنے سے شرم کرے جو تمام نافرمانیوں کی جڑ ہیں۔

دل و ذہن کا خیال ' ہر عمل کا محرک ہے 'اس سے شرم آنا چاہیے کہ دل میں برے خیالات کو جگہ دو اور پالو۔ پیٹ کے مطالبات ' بے جا خواہشات کی تکمیل کا سبب ہیں 'اس سے شرم آنا چاہیے کہ پیٹ میں حرام لقمہ ڈالو۔ موت کے بعد جسم کو مٹ جانا ہے 'اور اس سے شرم آنا چاہیے کہ اس بات کو بھلا کر زندگی 'جسم کی خواہشات پوری کرنے میں لگا دو۔ جب دنیا کو فنا ہو جانا ہے تو آخرت کے طالب بنو ' اور اس سے شرم کرو کہ ہمیشہ باقی رہنے والے آخرت کے جو انعامات اللہ کے پاس ہیں 'ان پر اس ختم ہو جانے والی دنیا کی زینت و لذت اور آرام و راحت کو ترجیح دو۔ اللہ سے شرم حیا کا حق یہی ہے۔

○

حضرت ابو سعیدؓ بیان کرتے ہیں:

ایک دن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لیے مسجد میں تشریف لائے۔ آپؐ نے دیکھا کہ بعض لوگ کھل کھلا کر ہنس رہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا:

اگر تم لذتوں کو ختم کر دینے والی موت کو کثرت سے یاد کرتے 'تو وہ تمھیں اس طرح ہنسنے سے روک دیتی۔ پس موت کو بہت زیادہ یاد کیا کرو جو تمام لذتوں کا خاتمہ کر دینے والی ہے۔

(یاد رکھو ') قبر ہر روز کہتی ہے: میں اجنبی کا گھر ہوں 'میں مٹی کا گھر ہوں 'میں کیڑوں کا گھر ہوں!

جب کوئی مومن دفن کیا جاتا ہے تو قبر اس کو خوش آمدید کہتی ہے 'اور کہتی ہے: ''تو میری پیٹھ پر چلنے والوں میں مجھے سب سے زیادہ محبوب تھا۔ آج 'جب کہ تو میرے قابو میں دے دیا گیا ہے 'اور تجھے میرے پاس آنا پڑ گیا ہے 'تو تو دیکھے گا کہ میں تیرے ساتھ کتنا اچھا سلوک کرتی ہوں''۔

حضورؐ نے فرمایا: ''پھر اس مومن بندے کے لیے قبر 'تاحد نگاہ وسیع و کشادہ ہو جاتی ہے ' اور اس کے لیے جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔''۔

اور جب کوئی نافرمان بندہ دفن کیا جاتا ہے تو قبر اس کا برا استقبال کرتی ہے 'اس پر لعنت ملامت کرتی ہے 'اور کہتی ہے: ''تو میری پیٹھ پر چلنے والوں میں میرے لیے سب سے زیادہ ناپسندیدہ آدمی تھا۔ آج 'جب کہ تو میرے قابو میں دے دیا گیا ہے 'اور تجھے میرے پاس آنا پڑ گیا ہے 'تو تو دیکھے گا کہ میں تیرے ساتھ کیسا برا سلوک کرتی ہوں''۔

حضورؐ نے فرمایا: ''پھر قبر اس کے لیے تنگ ہو گی اور اس کو بھینچے گی 'یہاں تک کہ اس کی پسلیاں ایک دوسرے میں گھس جائیں گی''۔ یہ فرماتے ہوئے آپؐ نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں پیوست کر دیں۔ اس کے بعد فرمایا: ''اس پر ستر اژدھے مسلط کر دیے جائیں گے۔ ان میں سے ہر ایک اتنا زہریلا ہو گا کہ وہ زمین پر پھونک مارے تو اس کے زہر کے اثر سے زمین کبھی کچھ پیدا نہ کر سکے گی۔ پھر یہ سب اژدھے اس کو ڈسیں گے اور نوچیں گے 'اور ایسا ہی ہوتا رہے گا یہاں تک کہ

اسے اللہ کے سامنے حساب کے لیے پیش کر دیا جائے گا"۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قبر آدمی کے لیے جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے، یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا۔ (ترمذی، بحوالہ مشکوٰة باب البکا و الخوف)

موت اور آخرت میں جی اٹھنے کے درمیان، جس نوعیت کی زندگی بھی اللہ انسان کو عطا کرتا ہے وہ قبر کی زندگی ہے۔ قبر کی زندگی میں آرام ملے گا یا ایذا، اس کا انحصار آخرت کی طرح، اعمال پر ہو گا۔

جو دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے بے نیاز اور آخرت کے طالب رہے، وہ جنت کے مزے لوٹتے ہوئے آرام سے سوئیں گے۔ جن کا دل دنیا میں اٹکا رہا، اور آخرت سے غافل، وہ خوف ناک اور بھیانک ایذا و تکلیف سے دوچار رہیں گے۔

نبی کریمؐ ہمیشہ عذاب قبر سے پناہ مانگتے تھے۔ حضرت عثمانؓ قبر پر کھڑے ہوتے تھے تو داڑھی آنسوؤں سے بھیگ جاتی تھی۔ کہتے تھے کہ یہ آخرت کی پہلی منزل ہے۔

○

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں

ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کی اجازت طلب کی۔ آپؐ نے فرمایا: اس کو اجازت دے دو۔ (پھر فرمایا) یہ اپنی قوم کا بڑا برا آدمی ہے۔ جب وہ آپؐ کے پاس آکر بیٹھا تو آپؐ اس سے نہایت اتنی خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آئے، اور اس سے بہت مسکرا مسکرا کر باتیں کیں۔ جب وہ آدمی چلا گیا، تو حضرت عائشہؓ نے کہا: یا رسول اللہؐ، آپؐ نے اس شخص کو ایسا ایسا کہا۔ پھر آپؐ اس سے اتنی خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آئے، اور خوب میٹھی میٹھی باتیں کیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تم نے مجھے کب بد زبان اور بد اخلاق پایا ہے! اللہ کے نزدیک قیامت کے دن بد ترین آدمی وہ ہو گا جس کو لوگ اس کی بد زبانی اور بد اخلاقی کی وجہ سے چھوڑ دیں گے (بخاری، مسلم، بحوالہ مشکوٰة، باب حفظ اللسان و الغیبة و الشتم)

شیریں کلامی، خوش روئی اور خوش اخلاقی، اللہ کے نزدیک انتہائی اونچے درجے کے اعمال ہیں، اور اتنے اہم کہ ان میں کوتاہی ہو جائے تو انسان جہنم میں بھی پہنچ سکتا ہے۔

خوش اخلاقی کے مستحق صرف مسلمان اور اچھے لوگ نہیں، بلکہ برے لوگ، دشمن اور کافر بھی اس کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ قولوا للناس حسنا (لوگوں سے میٹھی بات کرو)

○

حضرت حذیفہؓ بیان کرتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم ضرور بھلائی کی ہدایت کرتے اور برائی سے روکتے رہنا، ورنہ اللہ بہت جلد تم پر اپنا عذاب مسلط کر دے گا۔ پھر تم اس سے دعائیں مانگو گے اور تمھاری دعائیں قبول نہ ہوں گی۔ (ترمذی، بحوالہ مشکوۃ، باب الامر بالمعروف)

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: لوگو، تم یہ آیت پڑھتے ہو کہ یا ایھا الذین امنوا علیکم انفسکم لایضرکم من ضل اذا اھتدیتم "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی فکر کرو، کسی دوسرے کی گم راہی سے تمھارا کچھ نہیں بگڑتا، اگر تم خود راہ راست پر ہو۔ (المائدہ ۵: ۱۰۵) (اور اس کا مطلب یہ سمجھتے ہو کہ تمھارا کام صرف اپنی اصلاح کرنا ہے، دوسرے غلط کام کریں تو تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچے گا، مگر) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ "لوگ برائی کو دیکھیں اور ان کو نہ روکیں تو اللہ بہت جلد ان سب (نیک و بد) پر عذاب نازل کر دے گا۔ (ابن ماجہ، ترمذی، بحوالہ مشکوۃ ایضاً)

معروف، نیکی اور بھلائی کو پھیلانا اور قائم کرنا، منکر، بدی اور برائی کو روکنا اور ختم کرنا--- یہی امت کا مشن ہے۔ یہ فریضہ ہر مسلمان مرد اور عورت پر عائد کیا گیا ہے (التوبہ)۔ اسی کی ادائگی پر امت کی زندگی اور عزت کا انحصار ہے۔ اس سے روگردانی کا نتیجہ ذلت و مسکنت اور اغیار کا تسلط ہے، اور خدا کی رحمت سے دوری (لعنت) ہے۔ اس لعنت کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ بارگاہ الٰہی میں آہ و زاری کریں گے، مگر ان کی دعائیں سنی نہ جائیں گی۔ (یہ منظر آج آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے)
معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی مذکورہ آیت کو اس فریضہ سے فرار اختیار کرنے اور ضمیر کو سلانے کے لیے کوئی آج ہی نہیں استعمال کیا جا رہا ہے، قرون اولیٰ میں بھی اس سے ایسا ہی غلط استدلال پایا جاتا تھا۔ اسی کی تردید حضرت ابوبکرؓ نے واضح الفاظ میں فرمادی۔
عذاب عام آتا ہے تو وہ نیک لوگوں کو بھی نہیں چھوڑتا، سوائے اس گروہ کے جس نے رسولؐ کی معیت میں اتمام حجت کا حق ادا کیا۔ ہاں آخر میں ہر شخص اپنی نیت اور عمل کے مطابق بدلہ پائے گا۔

○

حضرت اسامہ بن زیدؓ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
ایک آدمی قیامت کے دن لایا جائے گا اور اسے آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ اس کی انتڑیاں نکل پڑیں گی، اور وہ انھیں لیے لیے آگ میں پھرے گا، جس طرح گدھا اپنی چکی میں پھرتا ہے۔ دوسرے جہنمی اس کے پاس اکٹھے ہو جائیں گے اور پوچھیں گے: اے فلاں، یہ تیرا کیا حال ہے! کیا تو دنیا میں ہمیں نیکیوں کی تلقین نہیں کرتا تھا اور برائیوں سے نہیں روکتا تھا (پھر تو یہاں کیسے آ گیا؟)
وہ شخص کہے گا: میں تمھیں نیکیوں کی تلقین کرتا تھا مگر خود ان کے قریب نہیں جاتا تھا، اور تم کو برائیوں سے روکتا تھا، پر خود وہی کرتا تھا۔ (بخاری، مسلم، بحوالہ مشکوۃ)

ایمان کی حقیقت

ایمان کامل

مولانا بدر عالم میرٹھی

ایمان کی حقیقت کے عنوان سے تصدیق باللسان اور تصدیق القلب پر مولانا بدر عالم میرٹھی کی دو تحریریں ستمبر ۹۴ اور اکتوبر ۹۴ کے شماروں میں پیش کی گئی تھیں۔ اس سلسلہ کی یہ تیسری تحریر 'ایمان کامل' ہے۔

ایمان کا لفظی اور ذہنی وجود جب رسوخ و پختگی اختیار کر لیتا ہے' تو پھر یہی ایمان' جو اس منزل تک صرف ایک معنی تھا' اب رفتہ رفتہ شکل و صورت اختیار کرنے لگتا ہے۔

ارباب حقائق کے نزدیک تو معانی کا تجسد' ثابت شدہ حقیقت ہے۔ موجودہ تحقیقات کے مطابق بھی آج وزن' جو درحقیقت مادہ کی صفت تھی' حرارت کے لیے ثابت ہو چکا ہے۔ اس کے وزن کے لیے ایک مقیاس الحرارت بھی تیار کر لیا گیا ہے' اور اب بآسانی ہر شخص اپنی حرارت کا وزن کر سکتا ہے۔ اسی طرح آواز کو مدت تک ایک معنی تصور کیا گیا تھا جو ہوا میں آتی اور فنا ہو جاتی ہے۔ مگر حال کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عالم کی پیدائش سے لے کر آج تک جتنی اصوات' اس فضا میں نکلی ہیں' وہ سب کی سب محفوظ و موجود ہیں' اور ان سے استفادہ کی سعی ہنوز جاری ہے۔ ریڈیو کی محیر العقول ایجاد کی بنیاد یہی جدید انکشاف ہے۔ یہ سن کر آپ کو حیرت ہوگی کہ تحقیقات عصریہ' باوجود اس تمام جدوجہد کے' اب تک اس مقام تک نہیں پہنچ سکیں' جہاں ہمارے ارباب حقائق کی نظریں آج سے سیکڑوں برس پیشتر پہنچ چکی تھیں۔ شیخ محی الدین ابن عربی ؒ فتوحات مکیہ میں اصوات کے صرف وجود کی تصریح نہیں کرتے' بلکہ اس سے بڑھ کر ان کی صورتوں کے بھی قائل ہیں۔ اور یہ بھی کسی دلیل سے نہیں' بلکہ اپنے چشم دید مشاہدہ سے۔ دیکھیے سائنس اپنی برق رفتاری کے باوجود کب اس مقام تک پہنچتی ہے۔

اسی طرح ایمان بھی ابتدا گو تصدیق قلبی کا نام ہے، مگر یہ تصدیق، اعمالِ صالحہ کی آبیاری سے نشوونما پاکر، ایک نور کی سی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہی نور، ایمان کا وجودِ عینی کہلاتا ہے۔ حضرت لقمان کی وصیت میں منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا: اے بیٹے! جس طرح کھیتی بلا آبیاری کے سرسبز نہیں ہو سکتی، اسی طرح ایمان، بلا علم و عمل کے، پختہ نہیں ہو سکتا۔

امام ابن ابی شیبہ اور امام بیہقی اور امام ابو عبید اور امام اصفہانی نے اپنی اپنی کتابوں میں حضرت علیؓ سے روایت کیا ہے کہ پہلے ایمان ایک سفید نقطے کی شکل پر قلب میں نمودار ہوتا ہے، اور جتنا ایمان بڑھتا جاتا ہے، اسی قدر یہ نقطہ پھیلتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب ایمان مکمل ہو جاتا ہے تو سارا قلب سفید ہو جاتا ہے۔ یہی حال نفاق کا ہے کہ پہلے سیاہ نقطے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور بالآخر تمام قلب سیاہ ہو جاتا ہے۔ خدا کی قسم! اگر تم ایک مومن کا قلب نکال کر دیکھو تو بالکل سفید پاؤ گے، اور ایک منافق کا قلب دیکھو تو بالکل سیاہ دیکھو گے۔ لیکن معانی کے اس تجسد کے مشاہدہ کے لیے وہی تیز آنکھیں درکار ہیں جن کا ذکر اس آیت میں موجود ہے: فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ (ق ۵۰: ۲۲) "آج تیری نگاہ خوب تیز ہے"۔

صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ جس وقت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک شق کیا گیا تھا تو ایک سنہری طشت، ایمان و حکمت سے لبریز، لایا گیا، اور اسے آپؐ کے سینۂ مبارک میں لوٹ دیا گیا تھا۔ عجب نہیں کہ اس سے مراد ایمان کا یہی وجودِ عینی ہو۔ انبیا کے کمالات اکتساب کا ثمرہ نہیں ہوتے، بلکہ قدرت اسی طرح ان کے منازلِ کمالات خود طے کرا دیتی ہے۔

یہ نورِ تصدیق جس قدر رسوخ پیدا کرتا جاتا ہے اتنا ہی خواہشاتِ نفسانیہ کے حجابات اٹھتے جاتے ہیں۔ اور جیسے جیسے یہ حجابات اٹھتے جاتے ہیں، اسی قدر یہ نور اور منبسط ہوتا جاتا اور پھیلتا جاتا ہے۔ شدہ شدہ یہاں تک پھیل جاتا ہے کہ انسان کے تمام جوارح کا احاطہ کر لیتا ہے۔ اور یہ مومن گویا خود ایمان مجسم بن جاتا ہے، جسے دیکھ کر بے ساختہ خدا یاد آنے لگتا ہے۔

حضرت عبد الرحمن بن غنمؓ اور اسما بنت یزید فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: "کہ اللہ تعالیٰ کے سب سے بہتر بندے وہ لوگ ہیں کہ جب ان پر نظر پڑے تو خدا یاد آ جائے۔"

اس نور کی وسعت کی بقدر اوامر الٰہیہ کے امتثال اور محظوراتِ شرعیہ سے اجتناب کا جذبہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اخلاقِ رذیلہ زائل ہو جاتے ہیں اور اخلاقِ فاضلہ اس کی جگہ لے لیتے ہیں اور قلب کو وہ وسعت میسر آ جاتی ہے کہ سارا عالم اس کے پہلو میں مثل ایک نقطہ کے نظر آنے لگتا ہے۔ کیوں نہ ہو کہ مومن کا یہ وہ قلب ہے، جو اس کے پروردگار کی تجلی گاہ ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ملاحظہ فرمایئے:

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰہُ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ فَھُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّہٖ (الزمر ۳۹: ۲۲) بھلا جس کا سینہ اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کے لیے کھول دیا ' سو وہ روشنی میں ہے اپنے رب کی طرف سے۔

پھر دوسری جگہ ارشاد ہے

فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنْ یَّھْدِیَہٗ یَشْرَحْ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ (الانعام ۶: ۱۲۵) جس کسی کی ہدایت کا اللہ ارادہ کرتا ہے ' اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔

یہ شرح صدر بھی گو ایک معنی ہیں ' جس کا مطلب صرف اسلام کا فراخ دلی سے بلاپس و پیش قبول کر لینا سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر اس معنی کا بھی ایک وجود عینی ہے۔ وہ صرف یہ معنوی فراخی نہیں ' بلکہ وہ وسعت ہے جو مومن کامل اپنے قلب میں ' حساً بھی ' مشاہدہ کرتا ہے۔ اب حضرت رسالت کے حق میں شرح صدر کا جو مصداق ہو سکتا ہے ' اس کا خود اندازہ کر لو۔ قرآن امتنان کے لہجہ میں فرماتا ہے

اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ (الم نشرح ۹۴: ۱) (اے نبیؐ) کیا ہم نے تمھارا سینہ تمھارے لیے کھول نہیں دیا۔

وجود عینی کی علامات

حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ جب نور یقین قلب میں داخل ہوتا ہے "تو اس میں ایک فراخی اور کشادگی نمودار ہو جاتی ہے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا ' یا رسول اللہ ' اس کی کچھ علامات بیان فرمایئے۔ ارشاد ہوا ' اس کی تین علامتیں ہیں: ۱۔ آخرت کی طرف میلان ۲۔ دنیا سے نفرت ' اور یکسوئی اور ۳۔ موت سے پیشتر اس کی تیاری۔

یہ ہے ایمان کا وجود عینی۔ یہی دعوت انبیا علیہم السلام کا مقصد ہے ' اور اسی پر نجات مطلق یعنی بلاعذاب ' اور فلاح ابدی کا مدار ہے۔ اس ایمان کے بعد مومن کے کان "رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ" کی پر کیف صدا سننے لگتے ہیں۔ اس مومن کو اگر جلا کر خاک بھی کر دیا جائے اس کے جسم و جان کو ریزہ ریزہ کر دیا جائے تو بھی اس کے ذرہ ذرہ سے اسی ایمان کی صدا بلند ہوگی۔ یہ ایمان صرف ذہنی اور عقلی نہیں رہتا بلکہ دیگر محسوسات کی طرح ' محسوس ہونے لگتا ہے۔ اس کا نور آنکھیں دیکھتی ہیں۔

سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (الفتح ۴۸: ۲۹) سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں۔

قلب اس کی حلاوت اور شیرینی اس طرح محسوس کرنے لگتا ہے جیسا کہ زبان مٹھائی کی۔ یہ ایمان فطرت انسانی کا ایک مقتضا بن جاتا ہے اور جس طرح فطری خصائل زوال پذیر نہیں ہوتے ' اسی طرح یہ ایمان بھی ' زوال کے خطرہ سے ' بڑی حد تک مامون رہتا ہے۔

ہرقل ' جو بہت بڑا عالم کتاب تھا ' اسی وجود عینی کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ اس نے اپنے دوران مکالمہ میں ایک سوال ابوسفیان سے یہ بھی کیا تھا ' کہ اس پر ایمان لا کر کیا کوئی شخص مرتد ہوتا ہے ۔ اس پر ' ہزار عداوت کے باوجود ' جو جواب ابوسفیان کی زبان سے نکلا ' وہ صرف نفی محض میں تھا ۔ یہ سن کر ہرقل نے جو کلمات کہے ' اس کی علمی گہرائی کا خوب پتا دیتے ہیں ۔

یعنی ایمان ایسی ہی چیز ہے ' کہ جب اس کی بشاشت اور تراوٹ دلوں میں رچ جاتی ہے تو پھر نکلا نہیں کرتا ۔

یہ ایمان کے وجود عینی ہی کی طرف اشارہ ہے ۔ اسی کا نام ایمان کامل ہے ۔ اسی کو معرفت بھی کہا جاتا ہے ۔ علوم ابتدا میں صرف علوم رہتے ہیں مگر کچھ رسوخ کے بعد قلب میں اپنا ایک رنگ پیدا کر دیتے ہیں جس کے بعد قلب میں لطف اندوزی یا انقباض کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے ۔ اس وقت ان کا نام حال ہو جاتا ہے ۔ پھر اگر ترقی کر کے یہ رنگ اور رسوخ اور پختگی اختیار کر لیتا ہے ' تو اسی کا نام معرفت بن جاتا ہے ' اور اسی کو مرتبہ احسان سے تعبیر کر سکتے ہیں ۔ یہ علوم کی انتہائی معراج ہے ۔ پھر اس معرفت میں بے نہایت مراتب و مدارج ہیں ' اور ان ہی مراتب کے لحاظ سے مومنین کا تفاضل ہے ۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (الحجرات ۴۹: ۱۳) درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمھارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے ۔

اپنی تربیت کیسے کریں

تربیت کا مفہوم و مقصود

خرم مراد

یہ تربیت کے موضوع پر ایک زیرِ تحریر کتاب کا ایک باب ہے۔ زندگی رہی اور تکمیل کی کوشش جاری رہی، تو ان شاءاللہ وقتاً فوقتاً دیگر ابواب بھی پیش کیے جاتے رہیں گے۔

اپنی تربیت کیسے کریں؟ یہ ہماری زندگی کا انتہائی اہم سوال ہے۔ اتنا اہم کہ ساری زندگی کی ہمیشہ ہمیشہ کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار اسی سوال پر ہے۔ یہ سوال زندگی بھر درپیش رہتا ہے، کیونکہ تربیت کی جستجو آخر دم تک کی جستجو ہے۔ یہ بڑا پریشان کن سوال بھی ہے۔ بار بار پریشان کرتا ہے، اور نئے نئے مسائل کھڑے ہوجاتے ہیں، پرانی ناکامیوں سے کسی طرح پیچھا چھوٹنے نہیں پاتا کہ نئی ناکامیاں دامن گیر ہوجاتی ہیں۔ آرزوئے دل اور محبوب نظر کی جستجو میں نکلتے ہی قدم قدم پر رکاوٹیں سامنے آتی ہیں۔

ارادے کرتے ہیں، عزم کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ عزم و ارادے سے زیادہ کمزور کوئی چیز ہی نہیں۔ پختہ عہد و پیمان باندھتے ہیں، سب ٹوٹ جاتے ہیں۔ لمبے چوڑے منصوبے بناتے ہیں، سب دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ خواہشات کے جھکڑ چلتے ہیں، سب کچھ اکھاڑ پھینکتے ہیں۔ جذبات کا طوفان اٹھتا ہے، سب کچھ غرق کر دیتا ہے۔ علم کی کمی نہیں ہوتی۔ خوب معلوم ہوتا ہے کہ کیا چیز نیکی ہے اور کیا چیز بدی، لیکن فیصلہ کن وقت آتا ہے تو سب کچھ بھول جاتا ہے، نیکی ایک طرف رکھ دیتے ہیں اور برائی میں پڑ جاتے ہیں۔ توبہ استغفار کرتے ہیں، پھر وہی گناہ دوبارہ کرتے ہیں، بار بار کرتے ہیں۔

پھر مایوسی کے تاریک سائے ڈیرے ڈالنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہمت جواب دینے لگتی ہے۔ حوصلے پست ہونے لگتے ہیں۔ بہانوں اور عذرات کا سہارا ڈھونڈھنے لگتے ہیں۔ کوشش اور عمل کی باگ ہاتھ سے چھوٹنے لگتی ہے۔ پھر دل بے معنی چیزوں کی تلاش شروع کر دیتا ہے: کوئی نسخہ ایسا ہو کہ ارادے اور عزم میں کبھی کمزوری نہ آئے، دنیا کی محبت دل سے نکل جائے، ایک دفعہ توبہ کرلیں تو گناہ دوبارہ سرزد نہ ہو۔ حالانکہ ایسا نسخہ تو فرشتوں کی فطرت میں ودیعت ہے، پھر انسان کی کیا ضرورت تھی۔ یا کوئی ایسا مردِ کامل مل جائے جو ہاتھ پکڑے اور بیڑا پار کرا دے۔ کسی کی توجہ، کسی کی نظر، کسی کی دعا ایسی ہو کہ کوشش اور مجاہدے کے بغیر ہی تربیت ہوجائے۔ لیکن ایسے مردِ کامل تو انبیا بھی نہ تھے۔ پھر جب ان تمام چیزوں میں ناکامی ہوتی ہے---- اور ناکامی کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے---- تو ہم اپنی حالت پر

قانع ہو جاتے ہیں، اس کے عفو و کرم سے امید لگا لیتے ہیں، تربیت کے سارے عزائم اور منصوبے ---- جو اکثر خواہشات سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتے ---- اٹھا کر ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔ پھر کسی اور طرف بھی نکل جاتے ہیں، الٹے پاؤں واپس بھی پھر جاتے ہیں۔

ان مسائل اور کیفیات و ادوار دات کی وجوہات مختلف ہوتی ہیں۔ کہیں تربیت اور تعمیر سیرت کے تصورات و مفہوم کے بارے میں غلط فہمیاں ہوتی ہیں۔ کہیں ان کے بارے میں غلط توقعات اور معیارات ہوتے ہیں۔ کہیں صحیح طریقوں کا علم نہیں ہوتا۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کہاں سے شروع کریں اور کیسے آگے بڑھیں۔ کہیں کمزوریوں اور برائیوں کے سرچشموں سے غفلت ہوتی ہے۔ کہیں غلو اور تعمق ہوتا ہے۔ کہیں گمراہ کن محرکات کا تل کھلا رہتا ہے، اور ہم فرش خشک کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔

اس طرح ہمیں بار بار ایسا لگنے لگتا ہے کہ تربیت سے زیادہ دشوار اور مشکل، کوئی اور کام ہے ہی نہیں، بلکہ شاید تربیت کرنا ہمارے بس میں ہی نہیں۔

اپنی تربیت کیسے کریں؟ کتاب میں، میں نے آپ کے اسی انتہائی اہم اور پریشان کن سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ میں نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ جو کام انتہائی دشوار اور ناممکن سا لگتا ہے، اس کی یہ حقیقت کھل جائے کہ وہ بڑا آسان کام ہے۔ اور اسے بڑا آسان ہونا ہی چاہیے تھا۔ اور جو کام ہم محض خواہش اور تمنا سے کرنا چاہتے ہیں، اس کے بارے میں یہ یقین بھی حاصل ہو جائے کہ وہ کام ارادے اور عملی کوشش کے بغیر ہو نہیں سکتا۔ ایسی عملی کوشش جو سادا بھی ہے، آسان بھی اور بالکل آپ کے بس اور اختیار میں بھی۔

تربیت، اپنی زندگی کی باگ ڈور اور چارج خود سنبھال کر خود ہی کرنے سے ہوتی ہے۔ صرف کتابیں پڑھنے، درس اور وعظ سننے، کورس اور پروگرام میں شریک ہونے، اور صحبتوں میں بیٹھنے سے بھی نہیں ہوتی۔ کوئی دوسرا وہ کام ہرگز نہیں کر سکتا جو آپ کے کرنے کا ہے۔ اللہ کی توفیق اور راہنمائی کے بغیر، اس کے ہاتھ پکڑ کے چلانے کے بغیر بھی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ لیکن اللہ کی یہ توفیق اور یہ دست گیری، اپنے کرنے ہی سے نصیب ہوتی ہے۔ يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ، وہ اپنی طرف اسی کو چلاتا ہے جو اس کی طرف رخ کرتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى، وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ، وہ لوگ جو راہ پر آتے ہیں، انھیں اللہ اور زیادہ ہدایت دیتا ہے اور انھیں ان کے حصے کا تقویٰ عطا کرتا ہے۔

یہ کتاب بھی آپ کو اپنے کرنے کی ذمہ داری سے فارغ نہیں کرے گی۔ جو کام آپ کے کرنے کا ہے، وہ نہیں کرے گی۔ اس میں کوئی "کھل جا سم سم" کا نسخہ نہیں، جو پڑھتے ہی تزکیہ و تربیت کے خزانوں کے دروازے آپ کے لیے کھول دے گا۔ اس میں کوئی طلسماتی چھڑی بھی نہیں کہ اس کو ہلاتے ہی آپ کی خود بخود ماہیت قلب ہو جائے گی۔ لیکن ہماری کوشش یہ ہوگی کہ تربیت و تزکیے کی

اور تعمیر سیرت کی صاف 'سیدھی اور آسان شاہراہ آپ کے سامنے کھل جائے۔وہ غلط فہمیاں دور ہو جائیں جو غلط راہوں پر لے جاتی ہیں 'یا مایوسی میں مبتلا کرتی ہیں۔کوئی کتاب زندگی بھر کی جستجو کے ہر پہلو کا احاطہ نہیں کر سکتی' نہ ہر سوال کا جواب اور ہر مشکل کا حل فراہم کر سکتی ہے۔لیکن ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کے ہاتھ میں جامع اور بنیادی امور پر مشتمل ایک مختصر سا دستورالعمل آجائے' اور وہ بنیادی خطوط اور کنجیاں بھی آجائیں جن کی روشنی میں آپ خود' باذن اللہ' اپنی راہ بنا سکیں' بند دروازے کھول سکیں' سوالات کے جواب اپنے دل سے پوچھ سکیں' اپنی مشکلات خود حل کر سکیں۔ ساتھ میں یہ صرف آپ کے علم میں اضافہ ہی نہ کرے' بلکہ کسی نہ کسی درجے میں اس علم کے مطابق عمل کرنے کا جذبہ' ولولہ' شوق اور استعداد بھی پیدا کرے۔

وبيد الله التوفيق، وهو المستعان

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے اور امید ہے ---کہ وہ اس کتاب کو قارئین کے لیے معاون و مددگار بنائے' اور اس راستے پر' الیُسریٰ پر ---چلنے کو آسان کر دے' جو نیکی اور تقویٰ کا راستہ ہے' جہاد اور غلبہ دین کا راستہ ہے' مغفرت اور جنت کا راستہ ہے' قرب الٰہی اور رضوان من اللہ کا راستہ ہے۔

اہمیت اور محبوبیت کیوں؟

تربیت' انتہائی اہم اور زندگی کے لیے ناگزیر چیز ہے۔تربیت ہر دل کی آرزو ہے' ہر دل کو محبوب ہے۔ایسا کیوں ہے؟

زندگی کی ساری تگ و دو محبوب مقاصد کے حصول میں کامیابی کے لیے ہوتی ہے۔زندگی میں سارا رنگ اور مزہ انھی محبوب مقاصد کے حصول کے دم سے ہے۔اس سے بحث نہیں کہ وہ مقاصد کیا ہیں۔وہ اعلیٰ بھی ہوسکتے ہیں اور ادنیٰ بھی' وسیع بھی ہوسکتے ہیں اور تنگ بھی' مادی بھی ہوسکتے ہیں اور معنوی بھی' انفرادی بھی ہوسکتے ہیں اور اجتماعی بھی' اچھے بھی ہوسکتے ہیں اور برے بھی۔جیسے مقاصد ویسی تربیت۔اس سے بھی بحث نہیں کہ ایک انسان نے جن مقاصد کو محبوب بنایا ہے' اور جن کے حصول میں کامیابی کو محبوب بنایا ہے' اور جن کے لیے وہ کوشاں ہے' وہ اس لائق بھی ہیں یا نہیں کہ ان کو مقصود و محبوب بنایا جائے۔تم کو تو انسانی فطرت کی یہ حقیقت یاد رکھنا چاہیے کہ جو بھی مقاصد ہوں' جب وہ محبوب ہوجاتے ہیں' تو ان کے حصول میں کامیابی بھی محبوب ہوجاتی ہے۔

کامیابی کے لیے ہی قرآن مجید نے مختلف مقامات پر فوز اور فلاح کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ایک دفعہ تم نے انسانی فطرت اور تگ و دو میں کامیابی یا فوز اور فلاح کا مقام جان لیا' تو تمھارے اوپر

قرآن کے ان تمام مقامات کے معانی کھل جائیں گے جن کا مرکز' حقیقی فوز اور فلاح کی طرف دعوت اور رہنمائی ہے۔

جب کوئی مقصد محبوب ہوتا ہے' تو اس مقصد میں کامیابی کے لیے تم وہ سارے ذرائع اور وسائل جمع کرتے ہو اور لگاتے ہو جو اس کامیابی کے لیے درکار ہوں' ان ذرائع و وسائل کو تم نشو و نما دے کر' تراش خراش کر اس لائق بھی بناتے ہو کہ وہ کامیابی کے حصول میں پوری طرح ممد و معاون ہوں۔ اور تم وہ ساری تگ و دو اور سعی و کوشش بھی کرتے ہو جو کامیابی کے لیے درکار ہو۔

اب یہاں ایک بات یہ اچھی طرح جان لو کہ اگر کسی چیز کے مقصد ہونے کا تمھیں دعویٰ ہے تو وہ تمھیں کتنا محبوب ہے' اس کی کسوٹی نہ تمھاری زبان سے اعلان ہے نہ تمھارے قلم سے۔ اس کی کسوٹی تو صرف یہ ہے کہ تم اس مقصد میں کامیابی کے لیے درکار ذرائع اور وسائل جمع کرتے ہو یا نہیں' اور کامیابی کے حصول کے لیے بھرپور تگ و دو کرتے ہو یا نہیں۔

دوسری بات یہ بھی اچھی طرح جان لو کہ جب مقصد واضح ہو اور واقعی محبوب ہو تو وہ خود ہی اپنے حصول کے لیے راہ نما اور استاد کا کام بھی کرتا ہے' وہ خود ہی منارہ نور اور قطب نما بھی بن جاتا ہے۔ بلکہ بعض حالات میں تو وہ ان وظائف کے لیے کافی ہوتا ہے' اور کسی اور ذریعہ کا محتاج نہیں ہوتا۔ یعنی مقصد بھی بتا دیتا ہے کہ اس کے حصول کے لیے کیا وسائل و ذرائع درکار ہیں' ان کو کیا اور کس طرح نشو و نما دینا ہے۔ وہ نشانات راہ بھی بتاتا ہے' راہیں بھی کھولتا ہے' طریقے بھی بتاتا ہے' اور سمت بھی صحیح رکھتا ہے۔

وسائل و ذرائع کیا درکار ہیں' اور ان کو نشو و نما دے کر کیا بنانا ہے کہ وہ مفید مطلب ہوں' اس کا سارا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ مقصد کیا ہے۔ اگر تمھیں سپاہی بننا ہے تو کتاب قلم نہیں' ہتھیار درکار ہوں گے۔ اگر عالم بننا ہے تو کتاب قلم کی ضرورت ہوگی۔

لیکن ایک چیز جس کی تمھیں ہر مقصد کے حصول کے لیے ضرورت ہوگی' وہ تمھاری اپنی شخصیت ہے۔ شخصیت کا لفظ ہم وسیع معنوں میں استعمال کر رہے ہیں۔ تمھارا جسم' تمھاری عقل' تمھاری معنوی صلاحیتیں' تمھارا دل' تمھارے جذبات' تمھارا کردار' تمھارے اخلاق' غرض ہر چیز شخصیت میں شامل ہے۔ اپنی شخصیت کو نشو و نما دے کر اس بات کا اہل بنانا کہ وہ اپنا محبوب مقصد حاصل کر لے' اسی کا نام تربیت ہے۔ مقصد کے حصول میں کامیابی کے لیے جو کچھ بننا ہمارے لیے ضروری ہے' یا جو کچھ ہم بننا چاہیں' وہ تربیت کے بغیر نہیں بن سکتے۔ اسی طرح جو محبوب مقصد ہم حاصل کرنا چاہیں' وہ ہم اس وقت تک صحیح طور پر یا مکمل طور پر حاصل نہیں کر سکتے جب تک اس کے لیے خاطر خواہ تربیت ہم حاصل نہ کرلیں' یا ہمیں حاصل نہ ہو جائے۔

یہ تربیت ہم منظم و مرتب کوشش سے بھی حاصل کرتے ہیں، اور بغیر کوشش کے بھی۔ اسی طرح شعوری طور پر بھی اور غیر شعوری طور پر بھی۔

ایک تربیت وہ ہے جو ہمارے جسمانی وجود کی تربیت ہے، ہمارے جسم کی، جسم میں بخشی ہوئی قوتوں اور صلاحیتوں کی، خصوصاً سوچنے سمجھنے، دیکھنے سننے (سمع، بصر اور فواد) اور عمل کرنے کی استعداد کی۔ اگرچہ اس کا بھی ایک حصہ اور ایک درجہ اپنے ارادے اور کوشش سے حاصل ہوتا ہے، مگر ہم خود کریں یا نہ کریں، چاہیں یا نہ چاہیں، یہ تربیت بڑی حد تک بہ ظاہر خود بخود ہوتی رہتی ہے۔ لیکن صرف بہ ظاہر۔ کیونکہ درحقیقت یہ ہمارے رب اور مربی کا دست قدرت و رحمت ہے جو ہماری یہ تربیت کرتا ہے۔ ماں کے پیٹ میں قرار پکڑتے ہی یہ تربیت شروع ہو جاتی ہے، اور عمر بھر جاری رہتی ہے۔ یہ تربیت نہ ہو تو ہمارا وجود، وجود میں ہی نہیں آسکتا، اور آجائے تو ایک بامعنی وجود نہیں بن سکتا۔

دوسری تربیت وہ ہے ہمارے معنوی وجود کی تربیت ہے۔ ہمارے دل و دماغ کی، ہمارے علم و فکر کی، ہمارے جذبات و احساسات کی، ہمارے اعمال و اخلاق کی اور ہمارے کردار اور سیرت کی تربیت ہے۔ اس تربیت کا ایک حصہ ہمیں پیدائشی طور پر ملتا ہے، ایک حصہ اپنے ماحول سے بھی ملتا ہے، لیکن فی الجملہ یہ تربیت ہمارے ارادے اور کوشش سے اور خود ہمارے کچھ کرنے سے ہوتی ہے۔ مگر غور کرو تو ہمارے ارادے اور کوشش کی حیثیت صرف شرائط کی ہے، ورنہ درحقیقت تو یہاں بھی ہمارے مربی، ہمارے رب اللہ تعالیٰ ہی ہیں، جن کو توفیق اور دست گیری کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ آخر اللہ کی پیدا کردہ اس کائنات میں کوئی چیز بھی ان کی مشیت اور تدبیر کے بغیر، خود بخود یا صرف کسی غیر اللہ کے کرنے سے کیسے ہو سکتی ہے؟

اس تربیت سے زیادہ اہم اور ضروری چیز ہمارے لیے اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس کے نتیجے میں ہمیں عقلی، علمی، معنوی، جسمانی اور پیشہ وارانہ صلاحیتیں اور مہارتیں حاصل ہوتی ہیں، جن سے ہم دنیا کے بڑے بڑے کام انجام دیتے ہیں۔ اسی سے ہمیں نیک سیرت، بلند و پختہ کردار اور پاکیزہ اخلاق کی بیش بہا نعمتیں نصیب ہوتی ہیں۔ نیکی، پاک سیرت، مضبوط کردار اور حسن اخلاق دنیا کی سب سے خوب صورت چیزیں ہیں، سب سے زیادہ محبوب اور عزیز ہیں، سب سے زیادہ قیمتی ہیں۔ دنیاوی مقاصد میں کامیابی کے لیے بھی یہ ناگزیر ہیں۔ دنیا میں حقیقی محبوبیت بھی عموماً انھی کے ذریعے ملتی ہے۔ مگر آخرت میں تو اپنے رب اور مربی کے نزدیک مقبولیت اور محبوبیت، اور اس کی قربت اور جنت، صرف اسی تربیت کے ذریعے نصیب ہو سکتی ہے۔ ان نعمتوں سے بڑھ کر اور کیا چیز محبوب ہو سکتی ہے۔ پھر تربیت ہمارے دل کی آرزو اور ہمارے دل کو محبوب کیوں نہ ہو کہ ان محبوب مقاصد

کے حصول کا ذریعہ ہے۔

اسی لیے دنیا و آخرت کی فلاح کو تزکیہ و تربیت پر منحصر کر دیا ہے۔ فرمایا: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی ، بے شک فلاح پا گیا جس نے بہ اہتمام اپنا تزکیہ آپ کیا (الاعلیٰ ۸۷: ۱۴)۔ اور فرمایا: قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا بے شک فلاح پا گیا جس نے مسلسل تدریج کے ساتھ اپنی شخصیت کا تزکیہ کیا (الشمس ۹۱:۹)۔ جنت کے سدا بہار باغ، نہریں اور بلند درجات اسی کے لیے ہیں "جو اپنے نفس کا تزکیہ کرے"۔ (طٰہٰ ۲۰: ۷۶)۔

مقصودِ تربیت: جنت

ہماری نگاہ و دل کے لیے کون سا مقصد سب سے بڑھ کر محبوب ہونا چاہیے، جس کے حصول میں کامیابی پر ہماری اپنی تربیت کی ساری کوشش مرکوز ہو۔

پہلے ہی قدم پر یہ فیصلہ کرنا اس لیے اہم اور ضروری ہے کہ جیسا مقصد ہوگا، اس کے حصول میں کامیابی کے تقاضوں کے مطابق ویسی ہی اپنی شخصیت ہمیں بنانا ہوگی اور اسی کے مطابق طریقے اختیار کریں گے۔ اگر کسی کا مقصد حصول علم ہے، تو کامیابی کے لیے وہ درس گاہوں میں جائے گا، اہل علم سے علم حاصل کرے گا، کتاب و قلم سے شغل رکھے گا، تجزیہ اور اظہار و بیان کی قدرت حاصل کرے گا۔ اگر کسی کا مقصد روحانی ترقی ہے، تو اسے ان میں سے کوئی چیز درکار نہ ہوگی۔ وہ کامیابی کے لیے خانقاہوں اور مشائخ کا رخ کرے گا، مجاہدہ و ریاضت کرے گا، ذکر و مراقبے سے شغل رکھے گا۔ اگر اسے جنگ لڑ کر جیتنا ہے، تو وہ کتاب و قلم اور ذکر و نفس کشی چھوڑ کر اسلحہ کا استعمال سیکھے گا اور قوت فراہم کرے گا۔

یہ بات ظاہر و عیاں ہے کہ ہماری زندگی کا سب سے محبوب مقصد، موت کے بعد زندگی میں جنت اور اللہ کی رضا و خوشنودی کا حاصل کرنا ہے۔ اللہ کے غضب اور اس کی آگ سے بچنا، اسی مقصد کی دوسری تعبیر ہے۔ آگ سے بچائے جائیں گے، اللہ کے غضب سے بچیں گے، لازماً جنت میں داخل ہوں گے اور رضائے الٰہی نصیب ہوگی۔ رضائے الٰہی جنت سے زیادہ بڑی چیز ہے، ورضوان من اللہ اکبر، لیکن دونوں میں کوئی تفاوت نہیں۔ جنت کی آرزو اور لالچ رضائے الٰہی کی طلب ہی کا تقاضا ہے۔ اللہ راضی ہوگا تو وہ آگ سے بچائے گا اور جنت میں داخل کر کے اپنی رضا سے سرفراز کرے گا۔ جو یہ کہتے ہیں کہ ہمیں اللہ کی رضا چاہیے، جنت سے کوئی سروکار نہیں، وہ رضائے الٰہی کے مفہوم سے واقف نہیں۔ دیکھو، ایک جگہ کہا گیا ہے کہ "وہ لوگ جو رضائے الٰہی کے حصول کے لیے اپنے نفس کو بیچ دیتے ہیں" (البقرہ)، اور دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ "اللہ نے مومنین سے ان کے جان و مال خرید لیے ہیں، اس عوض میں کہ ان کو جنت ملے گی" (التوبہ)۔

اللہ تعالیٰ نے یہ بات کھول کر، تاکید کے ساتھ بار بار ہمارے سامنے رکھ دی ہے کہ زندگی کی ساری تگ و دو کا مقصد جنت کے حصول میں کامیابی ہونا چاہیے۔ اصل زندگی، باقی رہنے والی زندگی، موت کے بعد کی زندگی ہے۔ وہاں، دو چیزوں میں سے ایک کو منتخب کر لو۔ اپنا محبوب و مقصود بناؤ۔

وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ (الحدید ۵۷: ۲۰) اس کے برعکس آخرت وہ جگہ ہے جہاں سخت عذاب ہے اور اللہ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی ہے۔

دنیا کی جس چیز کو بھی محبوب و مطلوب بناؤ گے، وہ دھوکے کی ٹٹی ہے، متاع الغرور ہے۔ اس لیے کہ آخری سانس نکلتے ہی وہ ساتھ چھوڑ جائے گی۔ اس زمین پر ہر چیز ہی فنا ہو جانے والی ہے، ختم ہو جانے والی ہے۔ باقی رہنے والی چیز صرف اللہ کی جلیل و کریم ذات ہے، اس کی خوشنودی ہے۔ دنیا کی چمکتی دمکتی چیزیں چاند سورج کی طرح ڈوبنے والی ہیں۔ ان کو زندگی کا محبوب بنایا تو ان کے ساتھ ساری زندگی کی تگ و دو اور ساری شخصیت بھی ڈوب جائے گی۔ اس لیے فرمایا:

سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ، (الحدید ۵۷: ۲۱)

دوڑو، اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو، اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان و زمین جیسی ہے۔

ایک دوسری جگہ فرمایا: سارعوا، دوڑ کر چلو جنت کی راہ (آل عمران) تم کو زندگی بھر جنت کی طرف ہی دوڑ لگانا ہے ـــ نہ ادھر دیکھنا، نہ ادھر سیکھنا، نہ ٹھیرنا، نہ ستانا ـــ تو ساری تربیت اس دوڑ کو جیتنے کے لیے ہی ہونا چاہیے۔

زندگی میں رنگ اور مزہ مقاصد میں کامیابی کے دم سے ہے، تو سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ تم جنت میں پہنچ جاؤ۔

وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ (آل عمران ۳: ۱۸۵)

اور تم اپنی (دنیا میں ساری تگ و دو کا پورا پورا اجر قیامت کے روز پاؤ گے۔ جو وہاں آتش دوزخ سے بچالیا جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے، کامیاب دراصل وہی ہے۔

کامیابی بھی کیسی کامیابی! بہت بڑی کامیابی (الفوز الکبیر)، نمایاں کامیابی (اَلْفَوْزُ الْمُبِيْنُ)، عظیم الشان کامیابی (اَلْفَوْزُ الْعَظِيْمُ)! سولہ مقام پر اللہ تعالیٰ جنت میں داخلے اور وہاں کی نعمتوں کا بیان کر کے فرماتے ہیں وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ ایک سو سے زیادہ مقامات پر انھوں نے جنت کی نعمتوں کو بیان کیا ہے۔ بعض جگہ تو ایک ایک چیز کی تفصیل بیان کی ہے۔ ان کا لالچ دیا ہے۔ انھی کو حاصل کرنے میں کامیابی کو زندگی بھر کا مقصود و مطلوب بنانے کی ترغیب دی ہے۔ کہا ہے کہ "یقیناً یہی عظیم الشان

کامیابی ہے۔ایسی ہی کامیابی کے لیے کام کرنے والوں کو کام کرنا چاہیے" (الصّٰفّٰت ۳۷: ۶۱) اور کہا ہے: "جو لوگ دوسروں پر بازی لے جانا چاہتے ہوں، وہ اس چیز کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کریں" (المطففین ۸۳: ۲۶) اس طرح شوق اور ولولہ پیدا کیا ہے، امنگ اور آرزو ڈالی ہے۔اور کارنامہ زندگی کے اختتام پر اسی انجام کو دل و نگاہ کا محبوب بنایا ہے:

يَآ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ۔ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً۔ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ۔ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ۔ (الفجر ۸۹: ۲۷-۳۰)

اے نفس مطمئن، چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو (اپنی کامیابی سے) خوش (اور اپنے رب کے نزدیک) پسندیدہ ہے۔شامل ہو جا میرے نیک بندوں میں، اور داخل ہو جا میری جنت میں۔

یکسوئی کا فیصلہ

تربیت کی راہ میں پہلا قدم یہی ہے کہ تم جنت کے بارے میں یکسو ہو جاؤ، اور فیصلہ کر لو کہ یہی مقصود زندگی ہے، اسی کے حصول میں کامیابی مطلوب ہے۔ساری تربیت کا مقصود یہی کامیابی حاصل کرنے کے لائق بننا ہے۔

ہم نے یکسوئی کے ساتھ فیصلہ کرنے کی بات کی ہے۔یہ بہت اہم ہے۔یہ زندگی بھر کا فیصلہ ہے۔اسے ایک دفعہ سوچ سمجھ کر کرنا ضروری ہے۔اگرچہ بعد میں بار بار دہرانا بھی ضروری ہے۔تم دو کشتیوں میں پاؤں رکھ کر کہیں بھی نہیں پہنچ سکتے۔ہمیشہ ڈگمگاتے اور لڑکھڑاتے رہو گے۔ساحل ہاتھ نہ آئے گا۔بدقسمتی سے آج ہمارے تربیت کے بیشتر مسائل اسی دوغلے پن کی وجہ سے ہیں۔تم ایک دفعہ جست لگا کر جنت کی کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ذہنی، قلبی اور نفسیاتی طور پر مکمل یکسوئی کے ساتھ، عملاً پہلا قدم راہ پر رکھ دو۔پھر دیکھو کیا کیا نہیں ہو سکتا۔

اس مقصد کے لیے مفید ہو گا اگر تم وضو کرو، دو رکعت نماز پڑھو، اپنی بساط بھر پورے خشوع و خضوع سے پڑھو۔پھر دوزخ کے سارے عذاب اور جنت کی ساری نعمتیں یاد کرو، اور اس وقت کا تصور کرو جب ملک الموت آ کر کہے گا کہ "وقت ختم! اب میرے ساتھ چلو"۔اور اس وقت کا بھی، جب اللہ کے حضور، روبرو کھڑے ہو گے، اور زندگی بھر کا فیصلہ ہو رہا ہو گا۔اور بس پھر فیصلہ کر لو کہ مجھے اپنی بساط بھر جنت کے لیے پوری پوری کوشش کرنا ہے۔پھر اللہ سے رو کر گڑگڑا کر، دعا کرو۔اس کے بعد جب اور جتنی بار چاہو، مانگتے رہو۔اور جن الفاظ میں چاہو مانگو:

اللھم انی اسئلک الجنة۔ وماقرب الیھامن قول اوعمل، و اعوذبک من النار، وماقرب الیھامن قول وعمل (ابن ماجه)

اے اللہ ' میں تجھ سے جنت مانگتا ہوں ' اور ہر اس قول اور عمل کی توفیق جو مجھے جنت سے قریب کرے۔ اور میں آگ سے پناہ مانگتا ہوں ' اور ہر اس قول اور عمل سے جو مجھے آگ سے قریب کرے۔

اللھم انی اسئلک ایمانا لا یرتد ، ونعیما لا ینفد ، وقرۃ عین لا تنقطع ، ورافقۃ نبیک سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم فی اعلی جنات الخلد (ابن ابی شیبہ)

اے اللہ میں تجھ سے ایمان مانگتا ہوں جو کبھی نہ چھینا جائے ' اور وہ نعمت جو کبھی نہ مٹے ' وہ لذت جو کبھی نہ ختم ہو ' اور ہمیشہ کی جنت کے بلند ترین درجات میں میں تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت مانگتا ہوں۔

عادات و اعمال کی اصلاح و تعمیر ' سیرت و کردار کی تعمیر ' یہ زندگی بھر کا کام ہے ۔ بتدریج ہوگا۔ ہوتا رہے گا لیکن کسی چیز سے محبت ہو جانا ' اس کی طلب پیدا ہو جانا ' اس کو حاصل کرنے کے لیے تڑپ اٹھنا ' اور اس میں لگ جانا ' یہ لمحہ بھر کا کام ہے ۔ محبت پہلی نظر میں بھی ہو جاتی ہے ۔ طمع و خواہش کے غالب آتے ہی آدمی جست لگا لیتا ہے ۔

برکات وثمرات

یہ فیصلہ ناگزیر ہے ۔ اس لیے کہ اسی سے ہی تمھاری تربیت کے مناہج ' نقوش و خطوط ' طریقے اور تدابیر کا تعین ہو گا۔

یہی تمھارے لیے کسوٹی کا کام کرے گا ۔ کیا بات کرو ' کیا نہ کرو ' کس طرح کرو ' کیا کام کرو ' کیا نہ کرو ' کیا صفت پیدا کرو ' کیا نکالنے کی کوشش کرو ۔ یہ فیصلہ اس طرح کرو گے کہ کیا چیز جنت کے قریب لے جائے گی ' اور کیا چیز اس سے دور اور جہنم سے قریب ۔ کیا چیز اللہ کو خوش کرے گی ' اور کیا چیز اسے ناراض ۔ قانونی مسائل کے صحیح علم میں مشکل پیش آسکتی ہے ۔ یہ باتیں تو سب کو معلوم ہیں ۔ چنانچہ ' جیسا ہم نے کہا ' یہ فیصلہ تمھارا سب سے بڑا راہنما اور معلم بن جائے گا۔

یہ فیصلہ تمھیں وہ ساری قوت اور جذبہ اور تحریک فراہم کرے گا ' جو تمھیں تربیت کی راہ میں درکار ہوگی ۔ سچی بات ہے کہ اگر تمھارے دل کو لگ جائے کہ تمھیں کسی منزل پر پہنچنا ہے ' کچھ بننا ہے ' کچھ حاصل کرنا ہے ' تو پھر یہ فیصلہ بھی تمھاری تربیت کے لیے کافی ہو سکتا ہے ۔ یہ تم کو آگے بھی بڑھائے گا اور تمھاری سمت بھی درست کرے گا ۔ بغیر اس کے کہ کوئی خارجی ذریعہ یہ کام کرے ۔ اس کی مثالیں موجود ہیں کہ مکہ میں لوگ آئے ' ایمان لائے ' جنت کا سودا کیا ' چند سورتیں سیکھیں ' واپس چلے گئے ۔ جیسے طفیل بن عمرو دوسیؓ اور ابوذر غفاریؓ ۔ پھر اس وقت آئے جب حضورؐ مدینے پہنچ چکے تھے ۔ لیکن یہ اپنے ایمان اور اسلام پر قائم بھی رہے اور ترقی بھی کرتے رہے ۔

فیصلہ کرو گے تو یہ بھی اچھی طرح جان لو کہ جنت کے علاوہ ہر چیز جو بہ ظاہر مقصود و مطلوب ہے '

اور جس کے حصول میں کامیابی تمھیں محبوب ہے، وہ فی الواقع مقصود حقیقی نہیں۔ تربیت بھی خود مقصد نہیں، نیک سیرت بھی خود مقصد نہیں، حسن اخلاق بھی خود مقصد نہیں، دعوت و جہاد بھی خود مقصد نہیں، غلبہ اسلام اور اقامت دین بھی خود مقصد نہیں۔ ہرچیز جنت کے حصول کا ذریعہ ہے، جس حد تک وہ صالح ہو، خالص ہو، اور آخرت میں باقی رہ جائے۔ ورنہ ان میں سے ہرچیز بھی فنا ہونے والی ہے۔

اگر تم اس بات کو اچھی طرح جان لوگے، اور اچھی طرح یاد رکھو گے، تو تربیت کی راہ کی بہت سی مشکلات دور ہوجائیں گی، بہت سے مسائل حل ہوجائیں گے، بہت سے فتنوں کی جڑ کٹ جائے گی۔ تربیت کی راہ آسان اور صاف ہوجائے گی۔ تربیت ہی کی نہیں، پورے دین پر عمل کی راہ بھی ان برکتوں سے معمور ہوجائے گی۔ اور دین کی ہر تعلیم اور ہر حکم پر عمل بھی تربیت کا ذریعہ ہی تو ہے۔ دین کی راہ دراصل تربیت ہی کی راہ ہے۔

پھر تم کچھ کرنا چاہو گے اور نہ کرسکو گے، کچھ چھوڑنا چاہو گے اور نہ چھوڑ سکو گے، کچھ بننا چاہو گے اور نہ بن سکو گے، تو نہ ہمت ہارو گے نہ مایوس ہوگے۔ ان میں سے کوئی چیز مقصود نہیں، مقصود جنت ہے۔ ہرکوشش کا اجر جنت ہے۔ ہرگناہ کے بعد استغفار کا موقع ہے، اور مغفرت جنت کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ پھر کوئی تمھاری دعوت قبول نہ کرے، کوئی تمھاری انا اور نفس کو ٹھیس پہنچائے، تم کو برسوں کام کرکے بھی دین کی راہ میں پیش رفت نصیب نہ ہو، تو بھی تم اسی عزم اور حوصلے کے ساتھ چلتے رہو گے۔ اس لیے کہ تم ان میں سے کسی کی طرف نہیں دوڑ رہے تھے، تم جنت کی طرف دوڑ رہے تھے۔

پھر تمھیں نہ خود اپنے اندر کمال کی طلب ہوگی، نہ دوسروں میں، اور نہ دوسروں کے نقائص کی وجہ سے تم اپنا کام ادھورا چھوڑ کر اپنی جنت کی منزل کھوئی کرنا چاہو گے۔ اس لیے کہ مکمل کمال صرف اللہ کو حاصل ہے، اور تمھارا مطلوبہ کمال فرشتوں کو، جو گناہ کر ہی نہیں سکتے۔ لیکن فرشتوں کے لیے جنت کی منزل نہیں۔ جہاں تمھیں اپنے کمال میں زوال یا نقص نظر آئے گا، وہیں تم اللہ کی پناہ لوگے، استغفار کروگے، اور مغفرت و جنت کی طرف چلنا شروع کروگے۔

جامعیت

یہ غلط فہمی نہ ہو کہ جنت، اور صرف جنت کو مقصود بنالینے سے دیگر تربیتوں کا محرک یا ضرورت ختم ہوجائے گی۔ کسی اور چیز کو تربیت کا مقصد بناؤ گے تو جنت خارج ہوجائے گی۔ جنت کو بناؤ گے تو یہ اتنا جامع مقصد ہے کہ ہرنوع کی تربیت اس میں شامل ہوجائے گی۔ کیا دیانت داری جنت میں نہیں لے جائے گی؟ پھر کیا اپنے فرائض کو دیانت داری اور بہ حسن و کمال انجام دینا جنت میں نہیں لے

جائے گا؟ پھر کیا اس مقصد کے لیے تربیت بھی جنت میں داخل ہونے کے لیے تربیت میں شامل نہ ہوگی؟ کیا زراعت و تجارت کر کے لوگوں کی ضروریات پوری کرنا جنت سے قریب نہیں کرے گا؟ کیا ان کاموں کو دیانت اور حسن و خوبی سے انجام دینے پر جنت نہیں ملے گی؟ پھر ان کے لیے تربیت جنت کے لیے تربیت کے دائرہ سے باہر کیوں ہو۔ کیا لایعنی چیزوں کو ترک کر دینا اسلام کا حسن نہیں؟ کیا وقت کے صحیح استعمال کی تربیت جنت میں جانے کے لیے ضروری نہ ہوگی؟ کیا نماز کا وقت پر پڑھنا جنت میں لے جانے میں مدد نہیں کرے گا؟ پھر کیا زندگی کے سب کام وعدوں کے مطابق وقت پر انجام دینے کی تربیت جنت کا مستحق نہیں بنائے گی؟ وعدوں کی پابندی تو ان اعلیٰ نیکیوں میں شامل ہے جن پر صراحتاً جنت کا وعدہ ہے۔ غرض جس پہلو سے غور کرو، ہر تربیت، جو ناجائز یا ناجائز مقاصد کے لیے نہ ہو اور جنت کی نیت سے ہو، جنت کی تربیت ہے۔ یہ مقصد انتہائی جامع مقصد ہے۔

آخری بات: پہلا قدم

تربیت کی راہ پر پہلا قدم یہی ہے کہ تم جنت کو ہی، اور صرف جنت کو، اپنی زندگی کا محبوب و مطلوب بنالو۔ جنت ہی پر اپنی نگاہیں جمالو۔ دل کو اسی کی آرزو، طمع اور امید سے بھر لو۔ چلو تو اس کی طرف چلو، دوڑو تو اس کی طرف دوڑو۔

یہ تمہارا سوچا سمجھا فیصلہ ہو، اس پر تمہارا دل پوری طرح مطمئن ہو۔ یہ تمہارے دل پر نقش ہو، یہ ہمیشہ تمہاری آنکھوں کے سامنے رہے۔ تم اسے بار بار یاد کرتے رہو۔ تمہاری زبان پر بھی اس کا چرچا ہو۔

حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے نزدیک مرتبے کے لحاظ سے بدترین شخص وہ ہوگا جس نے دوسرے کی دنیا بنانے کی خاطر اپنی آخرت برباد کر دی۔

(ابن ماجہ)

بیوی کا مرتبہ

اسوۂ رسولؐ کی روشنی میں

مولانا عبد الماجد دریا بادیؒ

ہجرت کے بعد کا زمانہ ہے۔ سرور کائناتؐ مدینہ منورہ میں رونق افروز ہیں۔ ایک بار چودہ شعبان کو شب میں بستر مبارک سے آہستہ سے اٹھتے ہیں۔ روایت بیان کرنے والی حضرت صدیقہؓ ہیں۔ وہ بھی وہیں آرام فرماتھیں۔ ردائے مبارک آہستہ سے اٹھاتے ہیں۔ حجرہ کا دروازہ آہستہ سے کھولتے ہیں اور چپکے سے قبرستان بقیع میں مومنین کے حق میں دعائے مغفرت کرنے تشریف لے جاتے ہیں۔ ام المومنینؓ روایت کرتی ہیں تو حضور انورؐ کی ہر جنبش کے لیے رویدا استعال کرتی جاتی ہیں۔ قام رویدا اخذ رداء رویدا وغیرہ' معنی "آہستہ" کے ہیں۔ یہ اس وقت ہر عمل میں آخر آہستگی کا اہتمام کیوں؟

جواب دنیا سنے گی؟ شوہروں کو تمام تر خدائے مجازی اور بیویوں کو تمام تر باندی سمجھنے والی دنیا سنے گی؟ آہستگی کا اہتمام اس لیے اور محض اس لیے کہ پاس لیٹی ہوئی عائشہ صدیقہؓ کی راحت میں بلاضرورت خلل نہ پڑے! اللہ اکبر! آج بڑے بڑے نرم مزاج شوہروں میں بھی ہیں کوئی صاحب' رفیقہ حیات کی راحت و آسایش کا اس درجہ اہتمام رکھنے والے؟

جس نے اپنی ازدواجی زندگی اس معیار کے مطابق گزار دی' حق پہنچتا تھا اسی کو کہ کھلے لفظوں میں اعلان کرے اور دنیا میں پکار دے: "خیر کم خیر کم لاهله و انا خیر کم لاهلی" تم میں بہترین انسان وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے حق میں بہتر ہو' مجھے دیکھو میں اپنے گھر والوں میں بہتر ہوں (ترمذی۔ ابن ماجہ)۔ یا پھر یہی پکار دوسرے لفظوں میں: "خیارکم خیارکم لنساءهم" (ابن ماجہ)۔ تم میں بہتر وہ ہے جو اپنی عورتوں کے حق میں بہتر ہو۔

نیکی اور بزرگی کا معیار آپ نے ملاحظہ فرمالیا؟ یہ نہیں کہ دفتروں اور کچہریوں میں' دوستوں کے مجمع میں' قومی جلسوں میں کون کیسا نظر آتا ہے بلکہ یہ کہ بیوی کے ساتھ برتاؤ کس کا نرم ہے۔ گھر کے

اندر صبر و تحمل کا ثبوت کون دیتا رہتا ہے اور جلوت میں نہیں خلوت میں کون کیسا ہے؟

سسرال جیل خانہ کا نام نہیں اور نہ لڑکی شادی کے بعد بیوی سے باندی بن جاتی ہے۔ آسان تھا کہ بجائے خطبہ نکاح میں تصریحات کے، محض اتنا کہہ کر لڑکی کا ہاتھ پکڑا دیا جاتا کہ "میاں لڑکی نہیں خدمت کو کنیز دی جارہی ہے۔" ان الفاظ سے دل' جو چھلکے سے بھر آنے کے لیے تیار ہیں ضرور بھر آتے، لیکن حقیقت کی ترجمانی نہ ہوتی۔ اسلام میں بیوی کنیز نہیں ہوجاتی' بیوی ہی رہتی ہے، تو کیا سب سے بڑے حکیم اور سب سے بڑے حاکم کا یہ فرمان کسی مسلمان تک نہیں پہنچا ہے کہ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ؟ یہ صیغہ امر بطور حکم ارشاد ہورہا ہے کہ بیوی کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ حسن معاشرت قائم رکھو! قید کسی خاص حالت کی نہیں، جوانی میں بھی اور بڑھاپے میں بھی، وہ حسین و جمیل ہو تو، اور حسن و جمال ظاہری سے محروم ہو تو۔ ڈھیروں مال لے کر آئے جب بھی، اور خالی ہاتھ آئے جب بھی۔ عزت رکھتی ہے، شوہر کی آمدنی پر حق رکھتی ہے، حیثیت و مرتبہ رکھتی ہے۔ لازم ہے کہ لحاظ اس کی عزت کا، حیثیت کا، مرتبے کا رہے، وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ جیسے مرد کے حقوق عورت کے ذمے ہیں ویسے ہی عورت کے بھی مرد کے ذمے ہیں۔ اور کیوں نہ ہوتے جب خلقت دونوں کی ایک رکھی گئی اور خلقت کی یکسانی کا گواہ کوئی دوسرا نہیں خود خالق کائنات ہے۔ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا۔ اللہ نے تمھاری بیویاں تمھیں میں سے پیدا کیں۔ تمھاری جنس سے ہے۔ اس کی فطرت تمھاری فطرت، اس کی خلقت تمھاری خلقت ہے۔ تمھیں اگر سیم و زر کی طلب ہے تو وہ بھی احتیاج مال سے بے نیاز نہیں رکھی گئی۔ تم اگر اپنی راحت و آسائش کے بھوکے ہو تو اس کا جسم بھی خستگی اور تھکن کے اثرات کو قبول کرنے والا بنایا گیا ہے۔ تمھیں اگر غصہ آتا ہے تو وہ بھی بے حس نہیں پیدا کی گئی ہے۔ تم اگر اپنی جان و عزت کے طالب ہو تو وہ بھی اپنی توہین و رسوائی سے خوشی نہیں حاصل کرتی۔ تم اگر حکومت چاہتے ہو تو وہ بھی غلامی کے لیے خلق نہیں ہوئی۔ "لوگو، اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت دنیا میں پھیلا دیے۔ اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے (النساء ۴: ۱)۔

الفاظ پر غور کرو، سارے انسانوں کی، مرد ہوں یا عورت، اصل ایک ہی ہے۔ ایک جوڑے سے مردوں اور عورتوں کی ساری نسلیں چلی ہیں۔ جذبات کی یکسانی کے اظہار کا اس سے بہتر طریقہ اور کیا ہوسکتا تھا۔ پھر حقوق پر صراحت سے ڈرایا ہے۔ اور حقوق قرابت کے لیے غایت اہتمام یہ ہے کہ ان کے ذکر کا عطف خود اپنے ذکر پر کیا ہے۔ اور ارشاد ہوتا ہے۔ وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا (روم ۳۰: ۲۱) تم ہی میں سے، تمھاری جنس سے، یہیں سے رد ہوا جاتا ہے ان مذاہب

باطلہ کا جنھوں نے مدت تک عورت کو بغیر روح کے مانا، ارشاد ہوتا ہے اور اسے بہ طور اپنے نشان قدرت کے پیش فرماتے ہیں کہ عورت تو تمھاری جنس کی چیز ہے۔ تم سے فروتر، پست تر، کوئی دوسری جنس نہیں۔ اس کی آفرینش سے یہ غرض نہیں کہ تم اسے باندی بنا کر رکھو، بلکہ وہ تو اس لیے ہے کہ: "لِتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً"۔ تم اس سے تسکین و راحت، سکون خاطر حاصل کرو۔ دونوں کے درمیان رشتہ اور تعلق آقائی اور کنیزی کا نہیں، محبت و الفت کا قائم کر دیا گیا ہے۔ الفاظ اس قدر صاف اور واضح ہیں کہ حاجت نہ کسی تشریح کی نہ حاشیہ آرائی کی، اصل مقصود زندگیوں کو محبت اور اخلاص سے شیریں بنا دینا ہے۔ اور جن لوگوں کی فطرت سلیم ہے وہاں بحمد اللہ یہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ میاں بیوی ایک دوسرے پر فریفتہ رہتے ہیں۔ لیکن جہاں بدقسمتی سے مذاق فاسد ہو چکے ہیں وہاں کے لیے ارشاد ہوتا ہے: فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔـا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا (النسا ٤: ١٩)۔ اگر تمھیں صورت، سیرت میں کوئی عیب بھی معلوم ہو تو تمھیں کیا خبر، کہ جو شے ناپسند ہو رہی ہو اللہ نے اس میں کوئی بڑی مصلحت، کوئی بڑی منفعت نہ رکھ دی ہو؟ آیت کے اس ٹکڑے کے مراقبہ کے بعد شوہر کے دل میں کچھ کشیدگی بیوی کی طرف سے باقی رہ سکتی ہے؟

حق افسری مرد کو یقیناً حاصل ہے اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ، مرد کی برتری بالکل مسلم و برحق' وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ، لیکن جو افسر ہے وہ اپنے حق کا استعمال کیوں کر کرے؟ اس کا جواب بھی قرآن لانے والے کی زبان سے سنیے۔ ابوہریرہؓ صحابی، معلم کائناتؐ کا ارشاد نقل کرتے ہیں:

نصیحت قبول کرو عورتوں کے باب میں نرمی کی، اس لیے کہ ان کی خلقت پسلی سے ہوئی ہے۔ اگر تم اس کو ہموار کرنے کی فکر میں لگے رہے تو اسے توڑ کر رہو گے اور اگر اس کے حال پر اسے رہنے دو گے تو کجی بدستور رہے گی، پس نصیحت قبول کرو عورتوں کے باب میں نرمی کی۔

خیال کر کے دیکھیے کہ عورت کے ساتھ بھلائی اور ملائمت کی تاکید کس درجہ ہے۔ حکم شروع بھی اسی سے ہوا اور ختم بھی اسی پر۔ درمیان میں ارشاد کی حکمت بیان ہوتی ہے۔ ٹیڑھی پسلی کو کوئی سیدھا کرنے کے درپے ہو جائے تو پسلی بھلا سیدھی ہو سکتی ہے؟ البتہ ٹوٹ کر رہ جائے گی۔ لیکن اگر کجی کی طرف سرے سے توجہ نہیں کی جائے گی تو خرابی جوں کی توں رہے گی۔ اس لیے ارشاد ہوتا ہے کہ اصلاح کی کوشش میں لگے رہو۔ لیکن ہمیشہ نرمی اور سہولت سے، محبت سے۔

آج عجمیت اور ہندویت کے اثر سے، فخر اس پر کیا جاتا ہے کہ ہم بیوی سے دبتے نہیں، دبا کر رکھتے ہیں، لیکن رسولؐ اسلام کو اس پر فخر نہ تھا۔ وہاں بیوی کی حیثیت، ماما اصیل کی، پیش خدمت کی، لونڈی باندی کی نہیں، اللہ کی بخشی ہوئی بہترین نعمت کی تھی۔ ابوامامہ صحابیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ مومن کے لیے تقویٰ الٰہی کے بعد کوئی نعمت، نیک

سیرت بیوی سے بڑھ کر نہیں۔

مبارک ہیں وہ نعمت والے جو نعمت کی قدر پہچانیں۔ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ اس فانی اور ناپایدار دنیا کی نعمتوں میں کوئی نیک سیرت بیوی سے بڑھ کر نہیں۔ عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا چند روزہ ہے------ لیکن اس چند روزہ عیش دنیا میں کوئی شے نیک سیرت بیوی سے بڑھ کر نہیں۔

رسولؐ کو رسولؐ ماننے والے سبق لیں' حیات طیبہ کے ان دو اہم ترین واقعات سے۔حضورؐ پر جب اول وحی نازل ہوئی تو قلب مبارک پر اس وقت قدرتی بے چینی تھی' اس وقت ذات مبارک کو تسکین دینے والی اور رسالت پر سب سے پہلی ایمان لانے والی ہستی' کسی دوست و عزیز کی نہیں' ام المومنین خدیجۃ الکبریٰؓ کی تھی۔ اسی طرح جب روح مبارک کسی کے دیدار کے لیے بے چین' اس جسد ظاہری سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہی تھی تو عین اس وقت سر مبارک کس کے زانو پر تھا؟ رفیقوں' عزیزوں میں سے کسی مرد کے نہیں' ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کے۔یہ ہے اسلام میں بیوی کا مقام!

سسرال میں بیوی جو کچھ کھاتی ہے اپنے حق سے' جو کچھ پاتی ہے اپنے حق سے۔بھک منگی نہیں کہ خیرات سمجھ کر ترس کھا کر دو چار پیسے اس کے آگے ڈال دیے' سائل گداگر نہیں کہ رات کی باسی روٹی کے ٹکڑے اس کے دامن میں پھینک دیے۔علم و حکمت کی اسی کان میں جس کا نام حدیث نبویؐ ہے' ایک روایت حکیمؓ بن معاویہ کے حوالے سے آئی ہے کہ ایک شخص نے خدمت نبویؐ میں آکر عرض کی کہ شوہر پر بیوی کا کیا حق ہے؟ فرمایا کہ شوہر جب خود کھائے تو اسے بھی کھلائے' جب خود پہنے تو اسے بھی پہنائے۔اس کے بعد یہ الفاظ آئے ہیں: اس میں عیب نہ نکالے (یعنی صورت سیرت کی ہجو نہ کرے) اور نہ یہ کہ اسے چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے' رکھے بہر حال اسے اسی مکان میں (ابن ماجہ)

ایک دوسری طویل حدیث کے آخر میں سے اس سے زیادہ تاکید تصریح کے ساتھ آتی ہے۔ خبردار رہو کہ بیویوں کا حق یہ ہے (لفظ "حق" یاد رہے۔کوئی رعایت اور احسان نہیں) کہ کھانے اور لباس میں ان کے ساتھ بہتر سے بہتر طریقہ برتو۔(ترمذی - ابن ماجہ)

بیوی اپنے شوہر کے گھر میں حاکم و مختار ہوتی ہے۔امام بخاری نے اپنی صحیح میں ایک باب کا مستقل عنوان یہی رکھا ہے۔ المراۃ راعیۃ بیت زوجھا - اور اس کے تحت جو حدیث درج ہے خود اس میں یہ الفاظ موجود ہیں: المراۃ راعیۃ علی بیت زوجھا - عورت حاکم ہے اپنے شوہر کے گھر پر۔یہ شاعری نہیں حقائق ہیں۔انشا پردازی نہیں' خدا اور رسولؐ کے احکام ہیں۔

قرآن میں کامیابی کا تصور

ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی

کامیابی ایک دلکش اور خوش نما لفظ ہے۔ اسی لیے یہ ہر مکتبہ فکر کے علمبردار اور ہر فکر و نظر کے حاملین کی سعی و کاوش کا مرکز توجہ بنتا ہے۔ بنی نوع انسان کا کوئی طبقہ ایسا نہیں ہے جو کامیابی کے حصول کا خواہشمند نہ ہو یا جس کے یہاں اور دیگر چیزوں کے مقابلے میں اس کی اہمیت و افادیت کم ہو۔ چنانچہ ایک طرف اس مادی اور غیر مستقل دنیا میں فوز و فلاح سے ہمکنار ہونے کے لیے طرح طرح کے ذرائع و وسائل کام میں لائے جاتے ہیں اور دوسری طرف کہیں مکتی، کہیں نروان، اور کہیں رضائے الٰہی کے تحت قوانین و ضوابط عملی زندگی میں نافذ کیے جاتے ہیں۔

دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اسلام میں دنیا کی بے ثبات زندگی اور اس زندگی کے بعد ابدی دنیا کی لازوال زندگی سے متعلق افکار و عقائد بہت واضح اور روشن ہیں۔ قرآن پاک کا تصور فلاح اور دنیا و آخرت میں اس کے خوش آیند ثمرات و نتائج سمجھنے کے لیے تصور فلاح سے متعلق دوسرے نقطہ ہائے نظر سامنے آجائیں تو اسلام میں کامیابی کے تصور کی وسعت و ہمہ گیری واضح ہوجاتی ہے۔

ا۔ کامیابی سے متعلق ایک تصور وہ ہے جو مادی تصور سے عبارت ہے۔ یہ تصور ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' کا ترجمان ہوتا ہے۔ مال و اولاد کی کثرت و فراوانی، فلک بوس عمارتیں، دلکش شاہراہیں، شاندار شاپنگ سنٹرز، جدید طرز کی دعوت نظارہ دیتی ہوئی گاڑیاں اور دیدہ زیب سڑکیں یہی کامیابی و کامرانی کے مظاہر و علامات ہیں۔ یہی طرز فکر مشرکین مکہ کا تھا۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شاہراہ دین پر چلنے کے نتیجے میں کامیابی کی ضمانت دے رہے تھے تو عناد و سرکشی میں ڈوبے ہوئے تھے وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ (السبا ۳۴: ۳۵) انھوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ ''ہم تم سے زیادہ مال و اولاد رکھتے ہیں اور ہم ہرگز عذاب پانے والے نہیں ہیں۔''

اس مادی اور مشرکانہ تصور کامیابی کے کڑوے اور کسیلے ثمرات سے یہ دنیا ظلم و عدوان اور وحشت و درندگی کا مسکن بن جاتی ہے، قوت و طاقت کی حکمرانی ہوتی ہے، اخوت و محبت اور ہمدردی و غمگساری بلکہ اخلاقیات کی ساری قدریں پامال ہوجاتی ہیں۔ نفرت کی بھٹی میں پسنا اور انسانیت کش اخلاق و عادات کا فروغ پانا اور تصادم و آویزش سے دنیا کی اس بزم کو رزم گاہ میں بدل دینا اس تصور کامرانی کے وہ نتائج ہیں جن کی ہیبت ناکیوں سے انسانیت کا لبادہ عظمت تار تار ہوجاتا ہے اور وہ

الامان والحفیظ کی صدائیں بلند کرنے لگتی ہے۔

دنیا سے متعلق دوسرا طرزِ فکر زہد و ترک دنیا کا ہے۔ اس کے مطابق دنیا مصائب و مشکلات کی آماجگاہ قرار دی جاتی ہے۔ ان سے نجات پانے کے لیے مذہبی اور اخلاقی قوانین و ضوابط پر مشتمل ایک نظام مرتب کیا جاتا ہے۔ اگر اس نظام کو عملی زندگی پر کماحقہ جاری و ساری کر لیا جائے تو ایک انسان کامیابی کی منزلِ مقصود سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ اس تصور فلاح کے تحت ترک دنیا لازم آتا ہے جسے قرآن پاک نے شانِ ایمان و اسلام کے منافی قرار دیا: وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ (الحدید ۵۷: ۲۷) اور رہبانیت انھوں نے خود ایجاد کر لی، ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا تھا۔

کامیابی کے متعلق ایک تیسرا نقطہ نظر ہے جسے موحدانہ یا خدا پرستانہ نقطہ نظر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس نقطہ نظر کے تحت ہم دیکھیں گے کہ مومن کے لیے دنیا کی کیا حیثیت ہے اور آخرت کی حقیقت کیا ہے؟ کیا دنیا یا سامانِ دنیا بندہ مومن کے لیے محبوب متاع ہے یا اسے شجر ممنوعہ قرار دیا گیا ہے؟ اگر وہ دنیا یا اسباب دنیا کو استعمال کرتا ہے تو کس نقطہ نظر سے اور کس حد تک؟ اگر دنیا کی کامیابی بھی کامیابی ہے تو آخرت کی کامیابی کی کیا حقیقت ہے اور کیا ایک مومن کے شایانِ شان ہے کہ وہ اس دنیا کی کامیابی کے لیے بھی فکر مند رہے؟

مخلوقاتِ ارضی و سماوی میں انسان کی حیثیت بہت ممتاز و نمایاں ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ آسمان و زمین کی تمام چیزیں اشرف المخلوقات کا درجہ پانے والے انسان کی خدمت گار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کائنات کی تمام اشیا پر قوت تسخیر عطا کی: وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِنْهُ (الجاثیہ ۴۵: ۱۳) اس نے زمین اور آسمان کی ساری ہی چیزوں کو تمھارے لیے مسخر کر دیا، سب کچھ اپنے پاس سے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے جہاں پوری کائنات کے لیے انسان کو پروانہ تسخیر عطا کیا وہیں دنیا اور سامانِ دنیا کی حقیقت بھی واضح کر دی۔ فرمایا: اِعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِينَةٌ وَّتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ (الحدید ۵۷: ۲۰) خوب جان لو کہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل اور دل لگی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تمھارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتانا اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے۔ ایک جگہ دنیا کی پرفریب چالوں سے قرآن پاک متنبہ کرتا ہے: فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُورُ - (لقمن ۳۱: ۳۳) پس یہ دنیا کی زندگی تمھیں دھوکے میں نہ ڈالے۔ اور نہ دھوکہ باز تم کو اللہ کے معاملے میں دھوکہ دینے پائے۔ ایک حدیث کے مطابق: آخرت کے مقابلے میں دنیا کو ایسی ہی نسبت ہے جیسے سمندر میں کوئی اپنی انگلی ڈالے اور دیکھے کہ اس پر کیا تری لگی ہوئی ہے۔ (ترمذی)

قرآنی تعلیمات اور فرمودات نبویؐ کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ دنیا نہ ہی مصائب و مشکلات کا

ٹھکانہ ہے جس سے دور بھاگا جائے اور نہ ہی ایسی نعمت غیر مترقبہ ہے جسے بے خوف و خطر تمام حدود و قیود کو پامال کر کے اپنانے کی جدوجہد کرنی چاہیے۔ مومن کی اصل منزل آخرت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے بندہ مومن کو توشہ آخرت کی فراہمی کے لیے فکر مندی کی تعلیم و تلقین کی ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ، (الحشر ۵۹: ۱۸) اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو، اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا سامان کیا ہے۔ سورۃ الصف میں اللہ تعالیٰ نے دردناک عذاب سے نجات کی تجارت کے لیے ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور مالوں اور جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کو ذریعہ بتایا ہے جو حقیقی کامیابی کی ضمانت دے دیتے ہیں۔ "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، میں بتاؤں تم کو وہ تجارت جو تمھیں عذاب الیم سے بچا دے؟ ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسولؐ پر، اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے۔ یہی تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ اللہ تمھارے گناہ معاف کر دے گا، اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اور ابدی قیام کی جنتوں میں بہترین گھر تمھیں عطا فرمائے گا۔ یہ ہے بڑی کامیابی۔ (الصف ۶۱: ۱۰، ۱۱، ۱۲) ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ۔ (الانعام ۶: ۱۶) اس دن جو سزا سے بچ گیا اس پر اللہ نے بڑا ہی رحم کیا اور یہی نمایاں کامیابی ہے۔ مرد مومن جب اپنی توجہات کا ہدف آخرت کی فوز و فلاح کو بنالیتا ہے تو وہ ہر شعبہ زندگی اور ہر گوشہ عالم میں اللہ و رسول کی اطاعت کو ہی سرمایہ زیست قرار دیتا ہے۔ دوستوں کی محفلوں میں، ذکر الٰہی کی مجلسوں میں گھر کے اندر اور مسجد و مدرسہ کی چار دیواری میں اور حق و باطل کی رزم گاہ میں کبھی بھی حق و صداقت کی شاہراہ سے گریز نہیں کرتا اور اپنی تمام تر سعی و جہد کا گوہر مقصود رضائے الٰہی کے حصول کو قرار دیتا ہے۔ قرآن کے مطابق رضائے الٰہی کی بیش بہا نعمت کا جو شرف جسے مل گیا وہ دراصل عظیم کامیابی کی منزل سے ہمکنار ہو گیا: وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ (التوبہ ۹: ۷۲) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کی خوشنودی انھیں حاصل ہوگی۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔

آخرت کی ابدی نوازشوں کے پیش نظر، اس چند روزہ زندگی میں خوشحالی و کامرانی اور عزت و سربلندی کا کوئی تصور بھی کیا مومن کی شان ایمان و اسلام کے منافی ہے؟ قرآن و سنت کی تعلیمات کی روشنی میں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دراصل چند روزہ زندگی میں ایک مومن کو جو عزت و توقیر ملتی ہے وہ خالق دو جہاں کی نوازش و کرم کا مظہر ہے۔ بلکہ قرآن پاک کے فرمان کے مطابق عزت و عظمت اور خیر و حسن بھی اس فانی و بے ثبات دنیا میں مومن کی طلب و جستجو کا موضوع بن جاتا ہے۔ ایک بندہ بارگاہ رب العزت میں سرنیاز خم کرتا ہے اور دست بدعا ہوتا ہے۔ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (البقرہ ۲: ۲۰۱) اے ہمارے رب، ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور

آخرت میں بھی بھلائی، اور آگ کے عذاب سے ہمیں بچا۔ انبیا کی دعوت و تبلیغ کی قرآنی سرگذشتوں کی روشنی میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان مقدس ہستیوں نے اپنی قوم کو یقین دلایا کہ لوگو! اگر اللہ واحد کی عبادت و پرستش کی ضمانت دے دو تو اللہ تعالیٰ تمھارے اس عمل کے نتیجے میں آخرت کی کامیابی عنایت فرمائے گا اور اس دنیا کے اندر بھی تمھیں اپنی نعمتوں سے محروم نہ رکھے گا۔ مثال کے طور پر حضرت نوحؑ کی دعوت و تبلیغ کی رویداد پیش نظر رکھی جائے۔ آپ پرسوز اور پر اصرار لہجے میں اپنی قوم سے گویا ہوتے ہیں: فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ، اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا - يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا - وَّ يُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّ يَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا - (نوح ۷۱: ۱۰، ۱۱، ۱۲) میں نے کہا "اپنے رب سے معافی مانگو، بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا، تمھیں مال اور اولاد سے نوازے گا، تمھارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمھارے لیے نہریں جاری کر دے گا"۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے پر آشوب اور پرفتن حالات میں مشرکین مکہ کو دعوت اسلام پیش کرتے ہیں اور فرماتے ہیں: اے لوگو! اگر تم لا الہ الا اللہ کہہ دو تو فلاح و کامرانی تمھارے قدم بوس ہوگی۔ یہاں دین و دنیا دونوں جہاں کی سعادت و کامرانی مقصود تھی۔ جہنم کے دہکتے ہوئے شعلوں سے نجات بھی اور کامیابی کا وہ تصور بھی مستحضر تھا جسے اہل مکہ ذہن و دماغ میں بسائے ہوئے تھے۔ قرآن میں نبی کریمؐ کی زبانی بار بار یہ تذکیر و تلقین اللہ کے بندوں کے ذہن نشین کرائی گئی کہ جو لوگ دین کے فروغ و اشاعت اور غلبہ و کامرانی کے مقدس مشن میں لگے رہتے ہیں انھیں نصرت الٰہی کا پروانہ مل جاتا ہے۔ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (المومن ۴۰ : ۵۱) یقین جانو کہ ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی مدد اس دنیا کی زندگی میں بھی لازماً کرتے ہیں۔ نبی کریمؐ کی زبانی ان بندگان خدا کو بشارت دی گئی ہے جو تقویٰ کی شاہراہ پر گامزن رہتے ہیں اور تمام معاملات و مسائل میں حسن عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ فرمایا گیا: قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ، لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ، (الزمر ۳۹: ۱۰) (اے نبیؐ) کہو کہ میرے بندو جو ایمان لائے ہو، اپنے رب سے ڈرو۔ جن لوگوں نے اس دنیا میں نیک رویہ اختیار کیا ہے ان کے لیے بھلائی ہے۔ مندرجہ بالا قرآنی تعلیمات اس موقف کی وضاحت کرتی ہیں کہ دنیا یا سامان دنیا سے متمتع ہونا معیوب نہیں ہے بلکہ اس عارضی دنیا کی یہ زوال آشنا مسرتیں بھی بندہ مومن کے لیے خدائے ذوالجلال کا قیمتی عطیہ ہیں۔ لیکن قرآنی احکام و فرامین یہ صداقت بھی آشکار کر دیتے ہیں کہ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے: وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (العنکبوت ۲۹: ۶۴) اصل زندگی کا گھر تو دار آخرت ہے۔ آخرت کی پایدار زندگی سے متعلق ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے: وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى - (الاعلیٰ ۸۷: ۱۷) حالانکہ آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے۔ چونکہ آخرت کی زندگی ہی قطعی اور

حتمی زندگی ہے اور خدا کی خوشنودی کا حصول ہی ایک مومن کی معراج ہے اس لیے اسی زندگی کے لیے فکر مندی کی ضرورت ہے۔ اخروی زندگی قرآن پاک کا وہ اہم موضوع ہے جسے جگہ جگہ دلائل و براہین کے ذریعے عام انسانوں کو بالعموم اور مومنین کو بالخصوص ذہن نشین کرایا گیا ہے۔ سورۃ الحشر میں اہل ایمان سے خطاب ہوتا ہے: يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ، (الحشر ۵۹ : ۱۸) اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو، اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا سامان کیا ہے۔

دونوں جہاں کی سعادت و کامرانی کے حصول کے لیے جو چیز سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے وہ ہے تقویٰ یا خشیت الٰہی۔ یہی تقویٰ جب دل کی دنیا پر حکمرانی کرنے لگے تو ایک انسان چاہے دن کی روشنی میں ہو یا رات کی تاریکی میں، گھر کی چار دیواری میں ہو یا آبادی سے دور کسی بیابان اور ویرانے میں، چوراہوں اور شاہراہوں پر ہو یا رزم گاہوں اور بزم گاہوں میں، وہ منکرات و سیئات کا باغی بن جاتا ہے اور خیرات و حسنات کلیپامی بن کر اعمال حسنہ کا جویا ہو جاتا ہے۔ وہ اس ایمان و ایقان کی نعمت سے بہرہ ور ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت دیکھ رہی ہو یا نہیں لیکن اس کا مالک حقیقی اس کی حرکت پر نظر رکھتا ہے، اس لیے شب و روز کے تمام معمولات و مشغولیات میں وہ اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہے۔

تقویٰ ایک جامع لفظ ہے۔ یہ ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور مجاہدہ فی سبیل اللہ بالاموال والانفس جیسی تمام کلیات دین پر مشتمل ہے۔ سورۃ الصف میں کامیابی کا یہ تین نکاتی پروگرام پیش کیا گیا ہے اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس بات کی ضمانت دی ہے کہ ان عوامل و محرکات پر کاربند ہو جایا جائے تو ایک مومن حقیقی کامیابی کی معراج حاصل کر لیتا ہے، وہ جنت کے باغات میں بہترین قیام گاہوں کا مستحق بن جاتا ہے اور دنیا کی نوازشوں کا بھی اہل قرار پاتا ہے۔

اللہ و رسول پر ایمان حلقہ اسلام میں شمولیت کے لیے شرط اولین ہے، وہ کلمہ حق کے مقدس اور انقلابی بول کی شکل میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ایمان و اعتراف اور وثوق و اعتماد کے ساتھ زبان سے اس کا اظہار کرتا ہے۔ باطل خداؤں کا انکار کر کے خدا کی شان وحدانیت اور محمد عربیؐ کی رسالت اپنی دنیائے دل میں بسا لیتا ہے۔ اس طرح ایک مومن مسلم کی حیثیت سے حق گوئی و بے باکی اس کا شعار بن جاتا ہے، اور اس کی نگاہ ہر شعبہ زندگی میں خدا پرستانہ ہو جاتی ہے۔ اس کا طریقہ زندگی مصطفویؐ ہوتا ہے۔ جہاں بھی وہ رہتا ہے ایک موحد کی شان سے رہتا ہے۔ دعوت و تبلیغ کی راہ میں اعتراضات و اختلافات اور مصائب و مشکلات اس کے پایہ استقلال میں لغزش کا سبب نہیں بنتیں بلکہ وہ عزم و استقلال کا پیکر بن کر، سیرت مطہرہؐ کو اسوہ زندگی بنا کر آلام و مصائب کی وادیوں کو سر کرتا چلا جاتا ہے۔

ہمہ وقت اور ہر لحظہ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کے مقدس اور حیات آفریں پیغام سے اس کا قلب و جگر معمور رہتا ہے۔ قرآن و سنت سے عشق و محبت کے باب میں حجتہ الوداع کے موقع پر سرور عالمؐ کی وصیت اس کے لیے قندیل بن جاتی ہے۔ چنانچہ وہ اس عالم آب و گل میں غلبہ دین کے محبوب مشن سے عشق کا ثبوت دیتے ہوئے شاعر کے اس کلام کی تاویل و تفسیر بن جاتا ہے۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دوعالم سے خفا میرے لیے ہے

ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کے بعد بندہ مومن کے فوز و فلاح کے لیے تیسرا عظیم سرمایہ ہے جہاد فی سبیل اللہ' جان و مال سے۔ فرمان باری تعالیٰ کے مطابق دین اسلام دوسرے تمام ادیان و مذاہب پر غالب ہونے کے لیے آیا ہے۔ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ (الفتح ۴۸:۲۸) وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے۔ اس عظیم المرتبت اور گراں بار مشن کی تکمیل میں ایمان باللہ اور ایمان بالرسول جہاں ناگزیر اور اہم ترین سرمایے کی حیثیت رکھتے ہیں وہیں مالوں اور جانوں سے جہاد کرنا بھی عظیم اور مقدس سرمایہ ہے۔ اقوام عالم کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جس قوم نے بھی مال و دولت کی فراہمی اور عیش و عشرت کے حصول کو اپنا مقصد زندگی بنایا وہ قوم اس طرح قعر مذلت میں گری کہ تاریخ کے صفحات میں محض درس عبرت بن کر رہ گئی۔ فرانسیسیوں کی ہزیمت و پسپائی ہو یا روم و ایران کی تباہی و بربادی یا پھر عہد عباسی میں مسلمانوں کی شوکت و عظمت کا زوال' ان تمام بربادیوں میں دنیا پرستی اور عیش کوشی کی حقیقت ناطق نظر آتی ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے حقیقی کامیابی کے حصول کے لیے مالوں اور جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کو قابل قدر اور موثر حربہ قرار دیا ہے تو اس میں یہ مصلحت پوشیدہ ہے کہ داعیان اسلام ایک طرف اللہ کی راہ میں مال و دولت کو خرچ کر کے اور دوسری طرف رضائے الٰہی سے والہانہ عشق کا مظاہرہ کرتے ہوئے وقت آنے پر اپنی جانیں بھی جان آفریں کے حوالے کر دینے سے گریز نہ کریں۔ قرآن پاک کی یہ بشارت ان کی تمنائے سرفروشی کو شہ دیتی ہے: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (التوبہ ۹:۱۱۱) حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔ اس عارضی دنیا کی مسرت و شادمانی کے حصول کی فکر و جستجو اور موت سے وحشت دراصل کسی قوم کی معنوی عظمت و وقار میں گھن کی طرح ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ مرض جب کسی قوم یا جماعت کو لاحق ہو جاتا ہے تو زوال و انحطاط اس کا مقدر بن جاتا ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ جب اس کے معنوی وجود کا وقار و عظمت بھی پیوند خاک

ہو جاتا ہے۔

امت مسلمہ اگر زندہ امت یا جماعت ہے، وہ زندگی چاہتی ہے اور حقیقی کامیابی کے گوہر مقصود کو حاصل کرنا چاہتی ہے تو اللہ کے فرمان کے مطابق مالوں اور جانوں کے ذریعے جہاد فی سبیل اللہ کے طریق پر گامزن رہنا ہو گا۔ دنیا کی جاہ و حشمت کو ٹھکرا کر حق و باطل کی معرکہ آرائی میں جاں فروشی کی نیک تمنا اور جذبہ صادق سے دلوں کی دنیا کو مزین کرنا ہو گا۔ امت مسلمہ کی ذلت و رسوائی اور ہلاکت و ادبار نیز اس کے اسباب و وجوہات کی تصویر کشی رسالتمآبؐ کی اس مقدس فرمان کی روشنی میں بھی ہو جاتی ہے: عنقریب تم پر وہ وقت آئے گا جب ہر سمت سے دوسری قومیں تم پر ٹوٹ پڑیں گی جس طرح کھانے والے دستر خوان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ایک صحابیؓ نے پوچھا، اے اللہ کے رسولؐ، کیا اس دن ہم لوگ تعداد میں کم ہوں گے؟ نبی کریمؐ نے فرمایا: تم لوگ اس دن تعداد میں زیادہ ہو گے لیکن سیلابی جھاگ کی طرح (بے قیمت و بے وزن) ہو جاؤ گے۔ تمھارے دشمنوں کے دلوں سے تمھاری ہیبت نکل جائے گی اور تمھارے دلوں میں بزدلی گھر کر جائے گی۔ ایک صحابیؓ عرض کرتے ہیں کہ ہم نے پوچھا بزدلی یا پست ہمتی کس وجہ سے آئے گی۔ آپؐ نے فرمایا: دنیا سے محبت اور موت سے نفرت (اس بزدلی کی) وجہ ہے۔ مرد مومن جب ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور جہاد فی سبیل اللہ کے ہتھیاروں سے لیس ہو جاتا ہے تو وہ اصل اور ابدی کامرانی کے حصول کا پروانہ پالیتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اس کی یہ عارضی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے اور اس غیر مستقل اور زوال آشنا دنیا کے اندر غربت و افلاس اور ذلت و محرومی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ قرآن ایک طرف ترک دنیا کو منافی اسلام عمل قرار دے کر دنیا کے حصے کو فراموش نہ کرنے کی تلقین کرتا ہے تو دوسری طرف علمبرداران اسلام کو عزت و سربلندی، غلبہ و کامرانی اور حکومت و سلطنت کی ضمانت دیتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے: حالانکہ عزت تو اللہ اور اس کے رسولؐ اور مومنین کے لیے ہے، مگر یہ منافقین جانتے نہیں ہیں۔ (المنافقون ۶۳: ۸)۔ جو شخص بھی نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے۔ (النحل ۱۶: ۹۷)۔ اور وہ دوسری چیز جو تم چاہتے ہو، وہ بھی تمھیں دے گا، اللہ کی طرف سے نصرت اور قریب ہی میں حاصل ہو جانے والی فتح۔ اے نبیؐ اہل ایمان کو بشارت دے دو۔ (الصّف ۶۱: ۱۳)

فرمان الٰہی ملاحظہ فرمایئے: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا، (النور ۲۴:۵۵) اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل

کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے' ان کے لیے ان کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے' اور ان کی (موجودہ) حالت خوف کو امن سے بدل دے گا۔ بندہ مومن کو دونوں جہانوں کی کامیابی سے متعلق یہ ضمانت صرف تعلیمات و نظریات کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ ہمارے سامنے ایک عملی نمونہ موجود ہے۔ صحابہ کرامؓ کی مقدس زندگیاں جب ایمان باللہ' ایمان بالرسول اور جہاد فی سبیل اللہ کے مرکز و محور پر استوار ہوئیں تو انھیں اسی دنیا کے اندر رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ کے مبارک الفاظ کی شکل میں ابدی کامیابی کا پروانہ مل گیا اور دوسری طرف عزت و عظمت' جاہ و حشمت و تمکنت جیسی خداداد نوازشوں کی شکل میں اسی دنیا کے اندر ان پر باران رحمت کا نزول ہوا۔

دنیا و مافیھا اور آخرت کے دوسرے نقطہ ہائے نظر کے مقابلے میں اسلام اعتدال و حکمت کی شاہراہ مستقیم پر گامزن نظر آتا ہے۔ دنیا نہ ہی مصائب و آلام کا مسکن ہے اور نہ ہی اصل مقصود۔ آخرت کی زندگی ہی دراصل ابدی اور لازوال ہے۔ یہاں کی مسرتوں کو زوال و فنا نہیں ہے۔ اس لیے اس اصل اور حقیقی کامیابی کے لیے ہی فکر مند ہونا چاہیے۔ اگر ایک بندہ خدا' اللہ و رسول پر ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ جیسے بیش قیمت سرمایوں کو ابدی زندگی کی فوز و فلاح کے حصول کے لیے لگا دیتا ہے تو وہ رضائے الٰہی کی نعمت سے مالا مال ہو جاتا ہے اور دنیوی خیر و حسن اور فوز و فلاح بھی اس کے قدم چوم لیتی ہے۔

آخر

مطالعہ النفس

میں کون؟

شہزاد الحسن چشتی

میں انسان ہوں۔ انسان ہی پیدا ہوا تھا، اللہ کی فطرت پر۔ بچپن، جوانی اور بڑھاپا، ہر دور میں انسان ہی رہا۔ جسمانی ساخت اور صلاحیتیں وہی رہیں بس ان میں ماحول، حالات اور عمر کے باعث تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ اور ہاں، میں انسان ہی مروں گا۔ اس لئے کہ ہر جاندار ---- چرند، پرند اور پیڑ پودے ---- سب کو فنا ہونا ہے۔ کل من علیھا فان اور کُلُّ نفسٍ ذَآئِقَۃُ الْمَوْتِ۔ پھر میں اپنے رب کے حضور بطور انسان ہی پیش ہوں گا، گذری ہوئی زندگی کے لحہ بہ لحہ حساب کے لیے۔ "پھر اس (انسان کی) تقدیر مقرر کی، پھر اس کے لیے زندگی کی راہ آسان کی، پھر اسے موت دی اور قبر میں پھر جب چاہے وہ اسے دوبارہ اٹھا کھڑا کرے۔" (عبس ۸۰: ۱۸۔۲۲) اور "وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا، --------- اور تمھاری صورت بنائی اور بڑی عمدہ بنائی ہے، اور اسی کی طرف آخر کار تمھیں پلٹنا ہے۔" (التغابن ۶۴: ۱۔۳)

مگر میں آیا کہاں سے ہوں؟ کیا بن مانس سے ترقی کرتا کرتا انسان بن گیا ہوں؟ جسمانی ساخت کچھ کچھ بن مانس کی طرح ضرور ہے لیکن گفتار اور عقل میں اور صحیح اور غلط کی تمیز میں اس سے بالکل جدا ہوں۔ اسی لیے حیوان ناطق ہوں، اسی لیے انسان ہوں۔ میری تخلیق خالق کائنات نے بالکل جدا طریقے پر کی ہے۔ سڑے ہوئے گارے سے پیدا ہونے والی مٹی سے میرا پتلا بنایا اور اس میں اپنی روح پھونک کر مجھے جیتا جاگتا انسان بنا دیا۔ "اسی نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا" (الرحمٰن ۵۵: ۳۔۴) "اللہ نے تم کو زمین سے عجیب طرح اگایا" (نوح ۷۱: ۱۷)

"اس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی، پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے، پھر اس کو نک سک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی، اور تم کو کان دیے، آنکھیں دیں اور دل دیے" (السجدہ ۳۲: ۷۔۹) "انسان کو اس نے ٹھیکری جیسے سوکھے سڑے گارے سے بنایا (الرحمٰن ۵۵: ۱۴) "جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا "میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں، پھر جب میں اسے پوری طرح بنا دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جاؤ۔" (ص ۳۸: ۷۰۔۷۲)

میرے وجود سے میرے رب نے میرے نصف بہتر کو پیدا کیا۔ یوں میرے وجود کی تکمیل ہوئی

اور پھر میری پیدائش کے نئے سلسلے کی داغ بیل ڈالی۔ ''لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا۔ اور ان دونوں سے بہت سے مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے' (النساء ۴ : ۱) ''اور تمھیں (مردوں اور عورتوں کے) جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا'' (النباء ۷۸: ۸)

اور اب میرا وجود نطفے کا مرہون منت ہے جو میرا رب ہماری (مرد اور عورت کی) پیٹھ اور پیٹ کے درمیان سے پیدا کرتا ہے۔ ''پھر ذرا انسان یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے'' (الطارق ۸۶: ۷۔ ۴)۔ ''کیا تو کفر کرتا ہے اس ذات سے جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا اور تجھے ایک پورا آدمی بنا کھڑا کیا؟'' (الکہف ۱۸: ۳۷)

نطفہ ماں کے بیض دان میں بھی جنم لیتا ہے اور باپ کے انثیون میں بھی۔ ماں کے بیض دان میں کوئی ایک خلیہ ارد گرد کے ماحول سے غذا لے کر پھلتا پھولتا ہے (خلیہ پروٹوپلازم کا وہ ٹکڑا ہے جس سے اینٹوں کی طرح ہر حیاتیاتی وجود کی تعمیر ہوتی ہے۔ ہر خلیہ اپنے اپنے کام کے لیے خصوصی طور پر بنا ہوتا ہے)۔ پھر دو مرحلوں میں تقسیم ہو کر چار خلیے بناتا ہے۔ اس کے مرکزہ میں موجود لون جسمیے (کروموسوم۔ ہر خلیہ میں ان کی مقررہ تعداد ہوتی ہے جو اس نوع کے لیے خاص ہوتی ہے) کی تعداد ۴۶ کی نصف یعنی ۲۳ رہ جاتی ہے۔ ان میں سے صرف ایک لون جسمیہ جو ''X'' کہلاتا ہے زن (مادہ) کی خصوصیات بردار ہوتا ہے۔ لون جسمیے ایک دوسرے سے الجھ کر کیمیاوی مادوں کا تبادلہ کر لیتے ہیں۔ یہی لون جسمیے ہیں جنھیں رب کائنات نے کیمیاوی اجزاء' ڈی آکسی رائبو نیوکلک ایسڈ (DNA) سے بنایا ہے اور انھی میں ماں کی ساری ذہنی اور جسمانی خصوصیات سمو دی ہیں۔ پیدا ہونے والے چار خلیوں میں سے صرف ایک پھلتا پھولتا ہے' بقیہ معدوم ہو جاتے ہیں۔ بس ہر ماہ اسی طرح کا ایک خلیہ وجود پاتا ہے اور یہی خلیہ میرا نصف وجود ہے۔ یہ بیض دان سے خارج ہوتا ہے اور بیض نالی میں داخل ہو جاتا ہے اور نالی کے کشادہ حصے میں میرے وجود کے دوسرے نطفے کا منتظر رہتا ہے۔

جب لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اس کے دونوں بیض دانوں میں چار سو ہزار بیضے بھرے ہوتے ہیں۔ بچی کے بلوغت تک پہنچتے پہنچتے یہ تعداد گھٹ کر دس ہزار رہ جاتی ہے مگر اپنی مادی طبعی عمر کے دوران میں صرف چار سو بیضے خارج ہوتے ہیں۔ یہ اللہ کی قدرت ہے کہ ہر ۲۸ ویں دن دائیں بیض دان سے ایک بیضہ خارج ہوتا ہے تو پھر ۲۸ دن بعد بائیں بیض دان سے دوسرا بیضہ خارج ہوتا ہے۔ ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے کہ کسی ایک بیض دان سے ایک سے زاید بیضے خارج ہوں یا دونوں بیض دان سے بیک وقت بیضے خارج ہوں۔ اول دن سے ۲۸ ویں دن تک بلکہ اس کے بعد بھی' اس کی پرورش

دماغ کی زیریں سطح پر موجود بلغمی غدہ، سے اور خوبیض دان سے پیدا ہونے والے ہارمون کے زیر اثر ہوتی ہے۔ یہ ہارمون حوا (ماں) کے جسم میں ماں بننے کی تبدیلیوں کو اجاگر کرتے ہیں اور وہ ماں بننے اور اس کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔

میرے وجود کا دوسرا نطفہ باپ کے انثیون میں موجود باریک باریک نالیوں کی دیواروں میں جنم لیتا ہے۔ ایک ہی وقت میں بے شمار خلیے اردگرد کے ماحول سے غذا لے کر پھلتے پھولتے ہیں۔ دو مرحلوں میں تقسیم ہو کر ہر خلیے سے چار خلیے بن جاتے ہیں۔ خلیے کے مرکزہ میں موجود لون جسمیون کی تعداد، ماں کے لون جسموں کی طرح چھیالیس سے نصف ہو کر ۲۳ رہ جاتی ہے۔ ان میں سے صرف ایک لون جسمیہ یعنی "X" میں "مادہ" کی خصوصیت ہوتی ہیں یا پھر "Y" میں "نر" کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ لون جسمیے اپنی تقسیم کے دوران ایک دوسرے سے الجھ کر کیمیاوی مادوں کا تبادلہ کر لیتے ہیں۔ یہی لون جسمیے ہیں جن میں رب کائنات نے مرد (باپ) کی ساری موروثی خصوصیات سمو دی ہیں۔ ہر چار خلیے منوئے کی مخصوص شکل و صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یعنی سر، درمیانی حصہ اور دم۔ دم کے ذریعے یہ متحرک رہتے ہیں۔ اور انثیون میں محفوظ رہتے ہیں۔ ایک وقت میں تین سو ملین منوئے بھرے ہوتے ہیں اور وقت آنے پر غدہ قدامیہ اور منوی تھیلی سے پیدا شدہ منی رقیق لیس دار مادہ کے ساتھ خارج کر دیے جاتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کا ذکر قرآن حکیم میں یوں کیا گیا ہے: "کیا ہم نے ایک حقیر پانی سے تمھیں پیدا نہیں کیا اور ایک مقررہ مدت تک اسے ایک محفوظ جگہ ٹھیرائے رکھا؟" (المرسلات ۷۷: ۲۰-۲۲)

میرا سارا سراپا نصف ماں کے نطفے میں اور نصف باپ کے نطفے میں ہے اور وہ بھی ڈی این اے کی کیمیاوی شکل میں مرغولوں کی صورت، جو اپنے رب کے حکم سے تقسیم ہوتے رہتے ہیں۔ باپ کا نطفہ ماں کے رحم میں ٹپکا دیا جاتا ہے۔ "اس نے نر اور مادہ کا جوڑا پیدا کیا ایک بوند سے، جب وہ ٹپکائی جاتی ہے" (النجم ۵۳: ۴۷)

تین سو ملین منویے اپنی دم کی ساری قوت سے رحم مادر سے گذر کر ۲۴ گھنٹے سے منتظر ماں کے نطفے کی طرف دوڑ لگاتے ہیں اور ان میں سے کوئی ایک ماں کے نطفے کی دیواروں کو چھید کر اس کے اندر قیام پذیر ہو جاتا ہے۔ دم باہر گرا دیتا ہے۔ بس اب ماں کا نطفہ کسی اور منویہ کا داخلہ مسدود کر دیتا ہے۔ لہٰذا بقیہ منویے دم کو توڑ دیتے ہیں اور ماں کے جسم کے رحم کی دیواروں میں جذب ہو جاتے ہیں۔ مادہ بردار یا نر بردار جنس والا منویے میں سے جو بھی ماں کے نطفے سے ملتا ہے، بس اسی وقت نر یا مادہ جنس کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ مگر بچے میں جنس کے اظہار کا وقت ۹ ہفتے کے بعد ہوتا ہے۔ "اسی نے نر اور مادہ کا جوڑا پیدا کیا ایک بوند سے جب وہ ٹپکائی جاتی ہے" (النجم ۵۳: ۴۷) "وہ تمھیں اس وقت سے

خوب جانتا ہے جب اس نے زمین سے تمھیں پیدا کیا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں ابھی جنین ہی تھے" النجم ۵۳: ۳۲)

میرا سارا وجود ماں کے بیضے اور باپ کے منویے کے باہم دگر ہونے کے باوجود اب بھی صرف ایک خلیے میں سمویا ہوتا ہے 'گو نصف موروثی خصوصیات ماں سے اور نصف باپ سے میرے وجود میں سما جاتی ہیں ۔ اب میرے اندر تقسیم در تقسیم کا عمل شروع ہوتا ہے ۔ ایک سے دو' دو سے چار' چار سے آٹھ جب چونسٹھ خلیوں پر مشتمل ہو جاتا ہوں تو آہستہ آہستہ لڑھکتے ہوئے رحم مادر پہنچتا ہوں ۔ رحم مادر کی دیواریں مجھے اپنی آغوش میں لے لیتی ہیں اور میں ان سے چپک جاتا ہوں اور پندرہ دن کے اندر اندر گوشت کے لوتھڑے کی صورت ہو جاتا ہوں ۔ رب کائنات میرے اور میری ماں کے رحم کی دیواروں کے درمیان ایک آنول کے ذریعے رشتہ جوڑ دیتا ہے اور مشیمہ کے ذریعے یہ رشتہ مضبوط ہو جاتا ہے ۔ میرے گرد ایک مضبوط جھلی پیدا کر دیتا ہے جسے پانی سے بھر دیا جاتا ہے ۔ اس طرح نہ صرف میری حفاظت کا انتظام ہوتا ہے بلکہ پانی کے اندر میری نشوونما کا انتظام کر دیا جاتا ہے ۔ "پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانک لیا تو اسے ایک خفیف سا حمل رہ گیا جسے لیے لیے وہ چلتی پھرتی رہی ۔ پھر جب وہ بوجھل ہو گئی تو ------------ (الاعراف ۷: ۱۸۹) پہلے میرا وجود گوشت کا لوتھڑا ہوتا ہے 'پھر ہڈیاں بنتی ہیں اور ہاتھ پاؤں' آنکھ' ناک وغیرہ پیدا ہو جاتے ہیں ۔ "ہم نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا ہے 'پھر نطفے سے 'پھر خون کے لوتھڑے سے 'پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی ------------ (الحج ۲۲: ۵'۷)۔" -------- پھر اس کو نک سک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی 'اور تم کو کان دیے' آنکھیں دیں اور دل دیے -------- (السجدہ ۳۲: ۹)

اس دوران میری ماں اپنے خون کے ذریعے مجھے غذا اور آکسیجن فراہم کرتی رہتی ہے اور میرے جسم کے گندے مادوں کو اپنے خون میں جذب کر کے باہر خارج کر دیتی ہے ۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو میرا وجود خطرے میں پڑ جائے ۔ ۴۵ دن بعد میرا اصل روپ اور سراپا جو ڈی این اے میں بند تھا' واضح ہو جاتا ہے اور نکھر جاتا ہے اور میں رحم مادر میں بطور جنین (Foetus) ۳۸ ہفتے تک نشوونما پاتا رہتا ہوں ۔ میری ماں میرا بوجھ اٹھائے لیے لیے پھرتی ہے اور خوش ہوتی ہے کہ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک' اس کا جگر گوشہ بس آیا کہ اب آیا ۔ وہ بوجھ اٹھانے کی ساری کلفتیں بھول جاتی ہے ۔ وہ دن گنتی رہتی ہے اور اس وقت کے لیے بے چینی سے منتظر رہتی ہے جس دن مجھے اس دنیائے آب و گل میں آنکھیں کھولنا ہیں ۔ اور وہ وقت بھی آ جاتا ہے ۔ ماں کے پیڑو میں سخت درد کی لہریں اٹھتی ہیں ۔ وہ چیخ چیخ اٹھتی ہے ۔ مگر اس کی چیخیں جلد ہی خوشی و انبساط میں تبدیل ہو جاتی ہیں ۔ رحم مادر کی دیواروں

کے سخت تشنج سے میرے گرد کی جھلی پھٹتی ہے، اردگرد کے پانی کے ساتھ ہی میں سر کے بل دنیائے آب وگل میں وارد ہوجاتا ہوں۔ منہ سے چیخ مارتا ہوں۔ یہ چیخ کر رونا میرے لیے ضروری ہے کیونکہ اس کے ساتھ ہی اللہ رب العزت میرے پھیپھڑوں میں ہوا داخل کر دیتا ہے اور میں سانس لینا شروع کر دیتا ہوں۔ اب بھی ماں کے رحم کی دیواروں کے ساتھ آنول سے جڑا ہوتا ہوں۔ اس کو کاٹ کر مجھے علیحدہ کیا جاتا ہے۔ اور پھر ماں جو ابھی چند لمحوں پہلے درد کی شدت سے چیخ و چلا رہی تھی۔ بے چین تھی پرسکون ہوجاتی ہے۔ مجھے دیکھ کر مسکراتی ہے اور شدت جذبات میں مجھے اپنے سینے سے چمٹا لیتی ہے اور میں آہستہ آہستہ اپنی ماں کی چھاتی سے چمٹ جاتا ہوں اور دودھ کی چسکیاں بھرنے لگتا ہوں۔ [illegible] تعلیم میرے رب نے اس وقت دے دی تھی جب مجھے وجود بخشا گیا تھا۔ ''ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت نکال لاتے ہیں (پھر تمھیں پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو'' (الحج ۲۲: ۵)

کیا تو کفر کرتا ہے اس ذات سے جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا اور تجھے ایک پورا آدمی بنا کھڑا کیا؟ (الکہف ۱۸: ۳۷)



دانتوں کی صفائی اور مسوڑھوں کی صحت کے لیے انتہائی موثّر نباتاتی

مسواک ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ

اچھی صحت کا دار و مدار صحت مند دانتوں پر ہے۔ اگر دانت خراب ہوں یا عدم توجّہی کے باعث گر جائیں تو انسان دُنیا کی بہت سی نعمتوں اور لذّتوں سے لُطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ زمانۂ قدیم سے صحتِ دندان کے لیے انسان درختوں کی شاخیں بطور مسواک استعمال کرتا آیا ہے۔ ہمدرد نے تحقیق و تجربات کے بعد دارچینی، لونگ، الائچی اور صحتِ دہن کے لیے دیگر مفید نباتات کے اضافے کے ساتھ "مسواک ٹوتھ پیسٹ" تیار کیا ہے جو دانتوں کو صاف اور سفید رکھنے کے ساتھ مسوڑھوں کو بھی مضبوط، صحت مند اور محفوظ رکھتا ہے۔

سارے گھر کا ٹوتھ پیسٹ

مسواک ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ

مسواک کے قدرتی خواص، صحتِ دنداں کی مضبوط اساس

ہمدرد

مدینۃ الحکمۃ تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ۔
آپ ہمدرد دوست ہیں۔ اعتماد کے ساتھ مصنوعات ہمدرد خریدتے ہیں۔ جائز منافع بین الاقوامی شہر علم و حکمت کی تعمیر میں لگ رہا ہے۔ اس کی تعمیر میں آپ بھی شریک ہیں۔

Adarts-HMPT-22/95

تعلیمی ادارے کا کردار

طارق سہیل مرزا

کچھ عرصہ ہوا میں اپنے ایک دوست سے ملنے اس کی فیکٹری میں گیا جہاں مشینوں میں ایک طرف خام مال یعنی آٹا ڈالا جارہا تھا اور دوسری طرف سے تیار بسکٹ نکل رہے تھے جو ایک ہی شکل، ایک ہی ذائقے اور ایک ہی رنگ کے تھے۔ میرا دوست کہنے لگا کہ میری طرح آپ بھی ایک فیکٹری کے مالک ہیں جہاں آپ کو تین چار سال کے بچوں کی شکل میں خام مال دیا جاتا ہے اور دس بارہ سال میں آپ کی پروڈکٹ (product) تیار ہوتی ہے۔ آپ کی اور میری فیکٹری میں فرق یہ ہے کہ میری فیکٹری میں بالکل ویسا ہی پروڈکٹ مجھے تیار ملتا ہے جیسا میرا تصور ہے۔ یہ ایک مکمل آٹو میٹک پلانٹ ہے۔ آپ کا مسئلہ یہ ہے کہ آپ اپنی سوچ کے مطابق فیکٹری نہیں لگا سکے۔ اس لیے آپ کی پروڈکٹ بھی آپ کے تصورات کے مطابق نہیں۔ اسی لیے معاشرے کی تعمیر بھی آپ کے تصور کے مطابق نہیں ہو رہی۔ کیونکہ جیسی تعلیم ہوگی، ویسے افراد ہوں گے، جیسے افراد ہوں گے ویسا معاشرہ ہوگا۔ میں نے کہا کہ تعلیم میں آٹو میشن نہیں ہو سکتی۔ آپ کا خام مال بے جان مادہ ہے جو نہ محسوس کرتا ہے نہ ردعمل (response) دیتا ہے۔ لیکن مدرسے کا طالب علم محسوس کرتا ہے، وہ سوچتا ہے، وہ ردعمل دیتا ہے۔ بھلا مدرسے میں آٹو میشن کیسے ہو سکتی ہے۔

جب میں فیکٹری سے باہر آیا تو میں سوچنے لگا کہ کیا مغرب نے اپنی فیکٹریوں کی طرح اپنے مدرسوں میں بھی آٹو میشن حاصل نہیں کرلی۔ کیا ٹکسال کے سکوں کی طرح ان کی پروڈکٹ ایک جیسی نہیں؟ کیا وہ ایک تصور حیات پر ایمان نہیں رکھتے؟ کیا وہ اپنی تہذیب کا نمونہ نہیں؟ ہمارے بہترین دماغ جو ان کے اداروں میں گئے، ان کی اکثریت کو ان اداروں نے اپنی آنکھیں، اپنے کان، حتیٰ کہ سوچ تک نہیں دے دی؟ آخر آٹو میشن اور کیا ہے؟

مغرب نے اپنی تہذیب کی شیطانی ڈور سے اپنے معاشرے کو باندھ دیا ہے۔ ہر آنے والے بچے کے گرد وہ ڈور بندھ جاتی ہے۔ یہ نظریات کی رسی، یہ تہذیب کی ڈور کون تیار کر رہا ہے۔ کون بڑی مہارت کے ساتھ اس رسی کے گرد معاشرے کی تعمیر کر رہا ہے۔ اس فیکٹری کا نام کیا ہے؟ اس کا نام ہے تعلیمی ادارہ۔

اب اپنے معاشرے کو دیکھیے، جس رسی کو مضبوطی سے پکڑنے کا حکم ہمیں تھا، جس رسی کے گرد معاشرے کی تعمیر ہمیں کرنا تھی، وہ کہاں ہے؟ جس طرح ایک باپ اپنی اولاد کو ورثے میں مکان

اور دوکان منتقل کرتا ہے، اسی طرح ایک نسل اپنی آنے والی نسل کو اپنے نظریات، اپنے افکار اور اپنی مہارتیں مدرسہ میں منتقل کرتی ہے۔ منتقلی کے اس عمل میں تصورات اور مہارتیں مزید بہتر ہوتی ہیں۔ وہ وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھلتے ہیں، اور دوسری نسل پہلی نسل سے زیادہ مضبوط و توانا ہو کر باہر نکلتی ہے۔

تعلیمی ادارہ ایک آبشار کی طرح ہے جس سے معاشرہ ایک دریا کی طرح سے رواں ہے۔ مدرسے سے تازہ پانی معاشرے کے دریا میں ہر آن شامل ہوتا رہتا ہے جو اسے تروتازہ رکھتا ہے اور اسے جوہڑ بننے نہیں دیتا۔ مدرسہ ایک آبشار ہی نہیں دریا کے دو کنارے بھی ہیں جو دریا کو اپنی حدود میں رکھتے ہیں۔ جس سے دریا رواں بھی رہتا ہے اور اپنی سمت بھی نہیں کھوتا۔ جب دریا اپنی حدود کے اندر بہے گا تو وہ اپنی طاقت کو قائم رکھے گا۔ دریا کی حدود اس کے کنارے ہیں اور معاشرے کی حدود اس کے نظریات حیات۔ دریا کے کناروں سے باہر بہنے والا پانی اپنی سمت اور قوت دونوں کھو دیتا ہے۔ اسی طرح اپنے نظریہ حیات سے باہر نکلنے والا فرد اور معاشرہ بکھر جاتا ہے۔

جس طرح پہلے دن ماں کے دودھ سے بچے کی جسمانی نشو و نما کا آغاز ہو جاتا ہے اسی طرح بچے کے کان میں اذان دینے سے روح کی غذا کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اللہ اکبر سے تصور حیات (concepts) دینے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ کان میں اذان دینے سے بچے کا مسلم معاشرے میں ایڈمشن ہو جاتا ہے۔ تصور حیات کے دریا کو اذان کے کوزے میں بند کیا گیا ہے۔

مدرسہ بذات خود ایک نہایت اہم اور حساس ادارہ ہے۔ تمام اہل الرائے کا اس بات پر کلی اتفاق ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کی داستان ان کے تعلیمی اداروں اور درسگاہوں میں ہی لکھی جاتی ہے۔ تعلیمی ادارہ معاشرے کا دل ہے۔ یہ درست ہو گا تو تمام شعبہ ہائے حیات درست ہوں گے اور اس کے خراب ہونے سے پورا نظام فساد اور خرابی کا شکار ہو جاتا ہے۔ تعلیمی ادارے کا آج، معاشرے کا اور کا کل ہے۔

مدرسہ ایک قدر افزا ادارہ (value added institution) ہے جو فرد کی افادیت بڑھا کر اسے معاشرے کے لیے زیادہ موثر بناتا ہے۔ صنعتی اداروں کی ریسرچ سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ صرف پرائمری تعلیم لیبر کی کارکردگی کو ۳۰ فی صد بڑھا دیتی ہے۔ نظریات انسان کو متحرک رکھتے ہیں۔ اسے قوت فکر و عمل دیتے ہیں۔

کیا تعلیمی ادارہ صرف آگے لے جانے والی قوت (driving force) ہی ہے؟
تعلیمی ادارہ ایک جوڑنے والی طاقت (binding force) بھی ہے۔

ہم کسی مسئلے پر سوچیں، ہم کوئی بھی عمل کریں، یہ فکر و عمل کسی بھی وقت اور کسی بھی جگہ وقوع

پذیر ہو' بنیادی تصورات کے ایک ہونے سے اس فکر و عمل کی روح ایک ہوگی۔ بنیادی تصورات کی یکسانیت معاشرے کو جوڑ کر رکھتی ہے' اس میں تفرقے کو روکتی ہے۔ تعلیمی ادارہ معاشرے کی روح عصر کی تشکیل کرتا ہے۔ بلکہ تعلیمی ادارہ ہی معاشرے کی روح عصر ہوتا ہے۔ وہ کیسے؟

کچھ چیزیں ایسی ہیں جنھیں ہم ادارے کی ظاہری شان و شوکت (cosmetices) میں شمار کر سکتے ہیں۔ جیسے کسی سکول کا فرنیچر اچھا ہے' اس کی بلڈنگ اچھی ہے' اس کا یونیفارم خوبصورت ہے وغیرہ جبکہ تعلیمی ادارے کی اصل روح میں دو چیزیں بہت نمایاں ہیں (۱) بنیادی تصورات حیات۔ (۲) مہارتیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو مدرسے کی ساکھ (credibility) کا تعین کرتی ہے؟ جب تصورات حیات اور مہارتیں جمع ہوتی ہیں تو اس تعلیمی ادارے کی ساکھ بنتی ہے۔ یہی ساکھ روح عصر ہوتی ہے۔ دوسری طرف یہی ساکھ معاشرے کی قوت نمو ہوتی ہے۔

تعلیمی ادارے کی ساکھ معاشرے کے مستقبل کی ضمانت ہوتی ہے' اس کی قوت اور وزن میں اضافہ کرتی ہے۔ ایک معاشرہ جس کے پاس کوئی تصور حیات نہ ہو' جو کوئی مہارت نہ رکھتا ہو' اپنی قوت نمو کھو دیتا ہے۔ وہ اپنے وزن سے محروم ہو جاتا ہے' اس کی طاقت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ معاشرہ مردہ ہو جاتا ہے۔

تعلیمی ادارے کی ساکھ کا رول کیا ہے؟ تعلیمی ادارے کی ساکھ سکول کی چار دیواری سے نکل کر گلی محلے تک آتی ہے پھر شہر میں اس کی شہرت ہوتی ہے۔ اگر تعلیمی ادارے کے بنیادی تصورات حیات اور مہارتوں میں قوت ہوتی ہے تو وہ اپنے معاشرے سے نکل کر دوسرے معاشروں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ تعلیمی ادارے اس معاشرے کی پہچان بن جاتے ہیں۔ جیسے مسلم دور کے ہسپانیہ کے مدرسے پورے یورپ پر اثر انداز ہوئے۔ جیسے آج کے دور کے یورپ اور امریکہ کے تعلیمی ادارے پوری دنیا کو متاثر کر رہے ہیں۔ وہ اپنے تصورات حیات کو اپنی مہارتوں کی مدد سے پوری دنیا پر لاگو کر رہے ہیں۔ ان کے تعلیمی اداروں نے دوسرے معاشروں کے تصورات حیات کو تلپٹ کر دیا ہے۔ جب معاشرہ اپنے تصورات حیات کے بہترین اور صحیح ہونے پر اپنا یقین کھو دے تو معاشرے میں ٹوٹ پھوٹ شروع ہو جاتی ہے۔ افراد کی قوت عمل متاثر ہوتی ہے اور معاشرہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا ہے جس کا ہم اپنے معاشرے میں مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ اگر دوسرے معاشروں سے آنے والے تصورات اپنے ساتھ مہارتوں کی قوت بھی رکھتے ہوں تو ان کے اثرات حیرت انگیز طور پر بڑھ جاتے ہیں۔ مغربی تہذیب اتنی طاقتور کیوں ہے؟ اس کی وجہ اس کا تعلیمی ادارہ ہے۔ جس نے مہارتوں کو تصورات کے تابع کر دیا ہے۔ یہی اس کے تعلیمی ادارے کا کمال اور طاقت ہے اور یہی ہمارے مدرسے

کا زوال اور کمزوری۔

مغرب کی تمام مہارتوں میں اور ان مہارتوں کے اطلاق اور استعمال میں اس کے بنیادی تصورات رچے بسے ہیں۔ ہم اپنے تصورات کو مہارتوں کے اندرون تک نہیں پہنچا سکے۔ یہ ہماری بنیادی کمزوری ہے۔ اس وقت ہمارا معاشرہ مغرب کے ان دونوں ہتھیاروں کا بیک وقت شکار ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ان کے تصورات بودے ہیں' ناقص ہیں بلکہ غلط ہیں لیکن کیا چیز ہے جو ان خلاف فطرت تصورات کو اتنا مضبوط بنا رہی ہے کہ وہ پورے کے پورے معاشرے تسخیر کر رہے ہیں۔ دراصل مہارتیں وسائل مہیا کرتی ہیں' مہارتیں قوت دیتی ہیں بلکہ مہارتیں بذات خود قوت ہیں۔ انھوں نے اپنے تصورات حیات کی کمزوری کو اپنی مہارتوں کی برتری سے پورا کر دیا ہے۔ ان دونوں قوتوں کا مجموعہ ہے مغربی تہذیب' مغربی معاشرہ اور یقیناً مغرب کا تعلیمی ادارہ۔

یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایک تعلیمی ادارہ دوسرے تعلیمی ادارے پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ مغرب کا تعلیمی ادارہ ہمارے تعلیمی ادارے پر غالب آ رہا ہے۔ ہمارا تعلیمی ادارہ' ہمارا تعلیمی ادارہ نہیں رہا' وہ مغرب کا مدرسہ بن رہا ہے' ٹوٹ رہا ہے۔ ایک تعلیمی ادارہ اپنے تصورات حیات کے مطابق اپنی تمام تر مہارتوں اور وسائل کے ساتھ ایک نئی دنیا تعمیر کر رہا ہے۔ ایک تعلیمی ادارہ اپنی ساکھ کے باعث اپنے معاشرے سے نکل کر دوسرے معاشروں کی تعمیر و تشکیل اپنے ڈھب سے کر رہا ہے۔ انھوں نے مدرسے کو نئی صورت دی ہے جس کی مدد سے وہ اب پوری دنیا کو اپنے تصور حیات کے مطابق تعمیر کر رہے ہیں۔ اور یہ نئی صورت گری بھی ان کی مہارتوں کا نتیجہ ہے۔ جس کی بناء پر وہ ایک سپر سکول (super school) قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس سے پہلے دنیا میں کہیں ایسا نہیں ہوا تھا کہ پورے کے پورے معاشرے ایک سکول میں داخلہ لیں' جن کا نصاب ایک ہو' جن کے اہداف ایک ہوں' جن کا استاد ایک ہو' جو سال کے ۳۶۵ دن میں ایک دن بھی بند نہ ہو' جو ۲۴ گھنٹے کھلا رہے۔ کیا پہلے کبھی ایسا مدرسہ رہا ہے؟ کوئی فرد پریشان ہو یا خوش' کوئی امیر ہو یا غریب' کوئی بوڑھا ہو یا جوان' کوئی بیمار ہو یا صحت مند' عورت ہو یا مرد' سب اس سپر سکول کے طالب علم ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا' پرنٹ میڈیا پر غالب آ چکا ہے۔ اس کا کوئی مد مقابل نہیں۔ یہ تعلیمی ادارہ اپنا کوئی مقابل نہیں رکھتا اور بغیر کسی خوف و خطرے کے اپنی مرضی کے مطابق معاشروں کی تعمیر و تشکیل کر رہا ہے۔ بلکہ معاشروں کو چیر پھاڑ رہا ہے۔

اب مغرب کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ چونکہ ہم ترقی یافتہ ہیں' اس لیے ہمارا تصور حیات ہی سب سے اعلیٰ ہے۔ جب کہ ہم ان کی مہارتوں سے مرعوب ہو کر ان کے غلط تصور حیات کو اپناتے ہیں۔ آج ہم ان کی مہارتوں کو زیر و زبر کر دیں یا ان سے بہتر مہارتیں لے آئیں یا موجودہ

مہارتوں میں اپنا تصور حیات سمو دیں (ہماری بقا اسی میں ہے کہ یہ کام جلد از جلد ہو' اس تہذیب کی زندگی اس وقت تک ہے جب تک مہارتیں ان کے غلط نظریات کا بوجھ اٹھائے رکھیں گی جونہی یہ بوجھ ان کی مہارتوں کی استعداد سے بڑھا' یہ تہذیب زمین پر آگرے گی' اب یہ وقت زیادہ دور نہیں) پھر دیکھیں ان کے تصور حیات میں کتنا دم خم ہے۔ خود ان کے بڑے بڑے چمپئن اپنے نظریہ حیات کو چھوڑ دیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کے غلط تصور حیات کے تحت ان مہارتوں کا معاشرے میں استعمال اور اطلاق ہی دنیا کے موجودہ بگاڑ کا سبب ہے' جیسے سیٹلائٹ کی مہارت بذات خود کوئی برائی نہیں رکھتی لیکن جن تصورات کے تحت اس کا استعمال ہو رہا ہے اس سے وہ تہذیب خود بھی نقصان اٹھا رہی ہے اور دوسرے معاشروں میں بھی بگاڑ پیدا ہو رہا ہے۔ یہ مہارت فحاشی پھیلانے کا ذریعہ بن گئی ہے۔ اسی طرح بنک کاری کی مہارت سودی نظام کے تحت معاشی استحصال اور ظلم کا سب سے بڑا ذریعہ بن گئی ہے۔ اس کے دباؤ سے اقدار ٹوٹ پھوٹ رہی ہیں۔ اسی طرح دیگر مہارتیں غلط استعمال کی وجہ سے اس تہذیب کو اس کے انجام کی طرف لے جا رہی ہیں۔ بقول اقبال "تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی"۔

اگر یہی مہارتیں اسلام کے تصور حیات کے تحت استعمال کی جاتیں تو فرد کتنا پر سکون ہوتا اور معاشرہ بھی کتنا پر امن۔ ہمارے تعلیمی ادارے کی مہارتوں کی کمی نے ہمارے تصور حیات پر' جو قیامت تک کے لیے ہدایت ہے' ایمان کو متزلزل کر دیا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ جس تعلیمی ادارے کا طالب علم، تصورات کا علم رکھتا ہے اس کے پاس مہارت نہیں۔ اس لیے وہ معاشرے میں موثر نہیں۔ اور جس کے پاس مہارت ہے اس کا تصورات کا ادراک خام ہے۔

حضرت عمرؓ تصورات اور مہارت کے امتزاج کی بہترین مثال ہیں۔ آپ تصورات کی معراج پر تھے۔ دوسری طرف اگر ہم آپ کی مہارتوں کے صرف ایک پہلو یعنی ایڈمینسٹریشن کو لیں تو پھر آپ جیسا ایڈمنسٹریٹر دنیا نے نہیں دیکھا۔ فن سپہ گری میں آپ بے مثال تھے۔ مہارتوں اور تصورات کی مطابقت کا فائدہ یہ بھی ہے کہ ٹوٹی ہوئی شخصیتیں پیدا نہیں ہوتیں۔

مدرسہ معاشرے کے اصل دھارے کی تشکیل کرتا ہے۔ اس کے لیے مقدار اور معیار کی ضرورت ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ مومن وہ ہے جس کا آج اس کے کل سے بہتر ہے۔ تعلیمی ادارہ یہ کام کرتا ہے۔ وہ طالب علم کا آج اس کے گزرے ہوئے کل سے بہتر بناتا ہے اور آنے والے کل کے وسیع امکانات سے اسے روشناس کرواتا ہے۔ مدرسہ ایک مکمل معاشرے کا ایک چھوٹا سا نمونہ اور اس کا حقیقی آئینہ ہوتا ہے۔ کسی معاشرے کا مستقبل دیکھنا ہو تو اس کے مدرسے کا حال دیکھیے۔

مدرسے کا آج' معاشرے کا کل ہے۔

ایک بڑی اہم بات یہ ہے کہ تصورات ہمیں ترجیحات دیتے ہیں۔ مدرسہ ان تصورات کے مطابق فرد اور معاشرے کی ترجیحات کا تعین کرتا ہے۔ تعلیمی ادارے کی ترجیحات' معاشرے میں جاری وساری ہوتی ہیں۔ لیکن مدرسے کی ترجیحات' معاشرے کی ترجیحات اس وقت بنتی ہیں جب مدرسہ معاشرے سے اپنی ساکھ کو منوا چکا ہو۔ مدرسہ اپنی ساکھ سے قوت نافذہ حاصل کرتا ہے۔ پورے معاشرے میں اسے جاری کرنے کے لیے ایک اور قوت کی بھی ضرورت ہے جس کی یہ خود تشکیل کرتا ہے۔

اب عمومی رجحان یہ ہے کہ معاشرہ اس وقت تک فرد کی ساکھ تسلیم نہیں کرتا جب تک وہ کسی بیرونی تعلیمی ادارے کی ڈگری نہ لے آئے۔ اس لیے ہماری ترجیحات کا تعین بھی بیرونی مدرسہ کرتا ہے۔

مدرسہ تین طرح کے افراد مہیا کرتا ہے۔ (۱) کارکن یا عام لوگ (۲) پالیسیاں بنانے والے (۳) پالیسیاں نافذ کرنے والے۔ واشنگٹن ٹائمز کے مطابق اس وقت تقریباً ۳ لاکھ پاکستانی امریکہ میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں سے جب کچھ لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے معاشرے کو لوٹتے ہیں تو وہ بیرونی تعلیمی ادارے کی سوچ اور مہارت اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ وہ تعلیمی ادرہ انھیں اہداف دیتا ہے۔ ان کی ترجیحات کا تعین کر کے بھیجتا ہے۔ جس تعلیمی ادارے سے وہ آتے ہیں اس کی ساکھ کے باعث وہ معاشرے میں پالیسیاں بنانے والے یا پالیسیاں نافذ کرنے والے کے طور پر اپنے کیریئر کا آغاز کرتے ہیں۔ اس طرح بیرونی مدرسہ اپنے معاشرے سے نکل کر ہمارے معاشرے میں قوت نافذہ حاصل کر لیتا ہے۔

انگریزوں نے ہمارے معاشروں کو قابو کرنے کے لیے اپنے قائم کردہ تعلیمی اداروں کے ذریعے ہی حکمران طبقہ پیدا کیا۔ ان کو ایک بڑی سہولت یہ حاصل تھی کہ سیاسی اقتدار ان کے پاس تھا۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے طے کیا کہ دنیاوی مناصب وعہدے صرف انھی کے لیے ہیں جو ان کے تعلیمی اداروں سے ہو کر آئیں گے۔ اس طرح انھوں نے گلی محلے کے کارکن اور کلرک سے لے کر ایوان حکومت کے بیوروکریٹس تک کا دائرہ بڑی جلدی مکمل کر لیا۔ اور یہ دائرہ آج بھی قائم ودائم ہے۔ ہمارا تعلیمی ادارہ اس دائرے کو توڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکا' اس لیے کہ حکمران قوت اس کے ساتھ نہیں۔ یہ قوت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے تعلیمی ادارے کا ہدف استاد' طالب علم' والدین' یا معاشرہ اور حکومت کے دائرے کو مکمل کرنا ہو۔ پھر تعلیمی ادارے کی ساکھ کے ذریعے اس کی کمان تعلیمی ادارے کے ہاتھ میں ہوگی۔ تب ہمارا تعلیمی ادارہ اپنے تصورات کے مطابق

معاشرے کی تعمیر کر سکے گا۔ لیکن اگر پالیسیاں نافذ کرنے والے مغربی مدرسوں سے مہارتیں لے کر آئیں اور صرف کارکن ہمارے تعلیمی اداروں کے ہوں' تو معاشرے کی تعمیر و تشکیل بیرونی مدرسہ ہی کرے گا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب بنگال پر قبضہ کیا تو اس وقت وہاں اسی ہزار مدرسے تھے۔ اسی ہزار مدرسوں کے ہوتے ہوئے بھی ایک قوم غلام ہو سکتی ہے؟ تاریخ میں ایسا ہو چکا ہے' وہ مدرسے آخر تصورات تو دے ہی رہے تھے' وہ بر سرکار تو تھے' پھر کیا کمی تھی جو اسی ہزار تعلیمی ادارے ہزاروں میل دور کے تعلیمی ادارے کے غلام ہو گئے۔ اس کی مختلف توجیہات پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن میں اس وقت کہوں گا کہ اس کی ایک وجہ مہارتوں کی کمی اور دوسری وجہ مدرسے کے اس دائرے کا ٹوٹنا تھا جو مدرسے سے شروع ہوتا ہے اور حکمران قوت پر مکمل ہوتا ہے۔ اس دائرہ کو ٹوٹے صدیاں بیت گئیں۔ باہروالوں نے تو صرف اس خلا کو پر کیا جو مدرسے یعنی گلی محلے اور ایوان حکومت کے درمیان تھا۔ یہ دائرہ اب بھی ٹوٹا ہوا ہے۔ یہ خلا اب بھی موجود ہے۔ آپ اسے محسوس کر سکتے ہیں۔ آپ اسے دیکھ سکتے ہیں۔ اب آپ کا' آپ کے مدرسے کا بڑا کام اس دائرے کو مکمل کرنا ہے۔ یعنی استاد' طلبہ' والدین یا معاشرہ اور ایوان حکومت ایک ہوں۔ ان کے تصورات ایک ہوں اور ان کو آگے لے جانے والی قوت ایک ہو' ان کو جوڑنے والی قوت ایک ہو' ان کے مفادات ایک ہوں' ان کے جذبات و محرکات کا سرچشمہ ایک ہو' ان کے احساسات ایک ہوں۔ آخر کونسا ادارہ یہ کام کرے گا۔ یہ کوئی نیا کام نہیں۔ یہ کام چودہ سو سال پہلے ہو چکا۔ عالم اسلام کی پہلی یونیورسٹی صفہ میں اصحاب صفہؓ نے اپنے معلم اعظم حضرت محمدؐ کی سرکردگی میں یہ کام کر کے دنیا کو دکھا دیا تھا۔

تعلیمی انقلاب کیا ہے؟ اس کی مختلف جہتیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن ایک بڑی جہت تصورات کا مہارتوں میں سمونا اور اس دائرے کا مکمل ہونا ہے تاکہ معاشرے کی حکمران قوت تعلیمی ادارے کی پشت پر آجائے۔ اگر کسی دوسرے ذریعے سے حکمران قوت مدرسے کی پشت پر آجاتی ہے تو وہ عمل انگیز کا کام تو کر سکتی ہے لیکن اسے اپنے آپ کو قائم رکھنے اور انقلاب کی تکمیل کے لیے اسی دائرے کو مکمل کرنا ہو گا۔ یہی تعلیمی انقلاب ہے بلکہ یہی انقلاب ہے۔

اس تعلیمی عمل کا حاصل کیا ہے؟ (اگر اسی ہزار مدرسوں کے ہوتے ہوئے ایک قوم غلام ہو سکتی ہے تو اسی لاکھ مدرسوں کے ہوتے ہوئے بھی ایسا ہو سکتا ہے)

اس کا حاصل یعنی اس تعلیمی عمل کی روح کو اگر دو لفظوں میں بیان کیا جائے تو وہ ہے حساسیت (senstivity) اور محبت۔

معاشرے کی تعمیر و ترقی میں مدرسے کا ایک انتہائی اہم کردار یہ ہے کہ وہ اپنے طلبہ میں حساسیت

پیدا کرے۔ جو تدریسی عمل اپنے متعلم میں یہ روح پیدا نہیں کرتا وہ عمل خام ہے۔ یعنی جہاں تصورات حیات کے خلاف معاشرے میں کوئی انفرادی یا اجتماعی حرکت ہو، متعلم اسے محسوس کریں، نہ صرف محسوس کریں بلکہ وہ اس وقت جہاں ہوں، کوئی سی بھی سماجی پوزیشن وہ رکھتے ہوں، اسے روکنے میں اپنا کردار ادا کریں۔

وہ حساس ہوں برائی کے خلاف، وہ حساس ہوں منکرات کے خلاف، وہ حساس ہوں، نواہی کے خلاف، وہ حساس ہوں، اوامر میں سبقت لے جانے میں۔ وہ اپنے تصورات کی حفاظت اپنے فکر وعمل سے کرنے میں حساس ہوں جیسے گیزر یا فریج کے تھرموسٹیٹ کو درجہ حرارت میں ایک درجے کی کمی بیشی معلوم ہوجاتی ہے۔ اسے معلوم ہوجاتا ہے کہ اسے اب On ہونا ہے یا Off۔

فرد برائیوں کے خلاف کتنا حساس ہے اور معروف پھیلانے کا اسے کتنا خیال ہے۔ اس حساسیت کی بنیاد صرف اور صرف ایک ہو اور وہ ہو اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت۔ تصورات کا ایسا شعور جو اسے محبت بھرا احساس نہ دے، بے کار ہوگا۔

فیکٹری کی طرح مدرسہ بھی اپنی پروڈکٹ کی کوالٹی چیک کر سکتا ہے۔ اس کا طریقہ ہے کہ اس حساسیت اور محبت کے پیمانے سے تصورات کی گہرائی اور گرفت کا اندازہ لگایا جائے۔ کیا ایمان اس کے علاوہ کچھ اور ہے؟ حساسیت ہوگی تو اس حدیث مبارکہ پر عمل ہوگا۔ کہ تم برائی کو دیکھو تو (۱) طاقت سے روکو، یہ ممکن نہ ہو تو (۲) زبان سے روکو، یہ ممکن نہ ہو تو (۳) دل سے برا جانو، یہ بھی نہ ہو تو ایمان کہاں ہے۔ کامیاب مدرسہ وہ ہے جو اس حساسیت کو پہلے درجے پر لے آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی اپنے تصورات کے مطابق معاشرے کی تعمیرو ترقی کر سکے گا۔

آخر مغرب سے ہماری لڑائی کیا ہے؟

ہم چاہتے ہیں کہ ہماری معاشرت، ہماری معیشت، اور ہماری سیاست غرض ہماری تمام زندگی ہمارے تصورات حیات کے مطابق ہو جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ اب تہذیبوں کی جنگ ہے اور اس میں ہماری سب سے بڑی حریف اسلامی تہذیب ہے۔ اب یہ جنگ مدرسوں میں لڑی جائے گی۔ مستقبل کا میدان جنگ کلاس روم ہے۔ کیا ہم اپنے مدرسوں میں اس کے لیے تیار ہیں؟

اعلان جنگ کب کا ہو چکا ہے!

اخبارِ اُمّت

معاہدۂ امن اور مورو مسلمانوں کا مستقبل

مسلم سجاد

اسپین کے بادشاہ فلپ کے نام پر رکھے گئے نام والے ملک فلپائن میں' مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کے ۴ سوسالہ تاریخی پس منظر میں' گذشتہ تیس برس کا جہاد اس ستمبر میں مورو نیشنل لبریشن فرنٹ (MNLF) کے صدر پروفیسر نور مسوری اور فلپائن کے صدر راموس کے درمیان معاہدہ پر منتج ہوا ہے۔ ساتھ ہی یہ سوال ذہنوں میں پیدا ہوگیا ہے کہ نور مسوری' دوسرے یاسر عرفات تو ثابت نہیں ہوں گے؟ مورو علما اس اندیشے کا اظہار کر رہے ہیں کہ مسلمان منڈاناؤ علاقے (ARMM) کا گورنر ہونا جو ٹریپولی معاہدے کے ۱۳ کے بجائے صرف ۴ صوبوں پر مشتمل ہے' حکمران جماعت کا امیدوار ہونا' اور فلپائن کے دستور سے وفاداری کا اعلان کرنا' نور مسوری کا مسلمان منڈاناؤ کی تحریک آزادی سے تعلق ختم کردے گا۔ مسلمانوں کی یہ دعا ہے کہ یہ معاہدہ ماضی کی بعض ایسی کوششوں کی طرح نہ ہو جس کے نتیجے میں مورو مسلمانوں کی مکمل سیاسی خود مختاری کے لیے جدوجہد زیادہ ظلم و جبر کا شکار ہوئی۔

معاہدہ کے تحت قائم ہونے والی امن و ترقی کی جنوبی فلپائن کونسل (SPCPD) اپنے علاقوں میں امن و ترقی کی سرگرمیوں میں رابطہ و نگرانی کرے گی۔ اس کے سب فیصلے صدر کی منظوری سے مشروط ہیں۔ اس معاہدہ کی مدت ۳ سال ہے جب کہ صدر راموس کی صدارت دو سال بعد ختم ہو رہی ہے اور دستور کے تحت وہ دوبارہ انتخاب نہیں لڑ سکتے۔ نہیں معلوم کہ آیندہ صدر کا رویہ کیا ہوگا۔ معاہدہ کے کئی نکات فلپائن کے دستور سے متصادم ہیں اور کانگرس اس پر کوئی بھی موقف اختیار کر سکتی ہے۔ دار الافتا قائم کیا گیا ہے جو چرچ اور ریاست کی علیحدگی کے خلاف ہے۔ کونسل کے لیے وسائل کی فراہمی صدر کی مرضی پر منحصر ہے۔ مورو آرمی کے ۷ ہزار ۵ سو فوجی فلپائن کی مسلح افواج میں ضم ہونا ہیں۔ اگر فوج کے تعلیم و تربیت کے معیار نافذ کیے گیے تو چند ہی اہل ثابت ہوں گے۔

برونائی' انڈونیشیا' ملایشیا اور فلپائن کے علاقے پر اس معاہدہ پر کامیابی سے عمل کے خوشگوار

نتائج ظاہر ہوں گے۔ صدر سوہارتو اور علاقے کے دوسرے ممالک نے نیک تمناؤں کا اظہار کیا ہے لیکن اس کی کامیابی کا انحصار دونوں فریقوں کی جانب سے اس پر نیک نیتی سے مکمل عمل پر ہے۔

شمال کے حکمران کیتھولک عیسائی ہیں اور اسلام کے خلاف تعصب انہیں ورثہ میں ملا ہے۔ ۴ سو سال قبل ۱۵۷۵ میں جب اسپین نے یہاں سلطان سلیمان کی سلطنت ختم کر کے قبضہ کیا تو انھوں نے یہاں سے اسلام کا نام و نشان مٹانے اور مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی مہم شروع کی۔ وہ اسپین میں یہی کام کر چکے تھے۔ مسلمانوں نے مزاحمت کی اور ایک نہ ختم ہونے والی جدوجہد شروع ہوگئی۔ اسپینی مسلمانوں کو MOORS کہتے تھے' اس لیے فلپائن کے مسلمان مورو کہلائے۔ اسپینی استعمار کے خاتمے کے بعد ایک مختصر وقفہ ملا اور پھر ۱۸۹۹ میں یہاں امریکی استعمار نے قدم جما لیے۔ جدوجہد کا نیا دور شروع ہوگیا۔ مسلمانوں نے کبھی شکست تسلیم نہ کی' کبھی مغلوب نہیں ہوئے۔ ۱۹۴۶ میں فلپائن کی آزادی کے بعد مسلمانوں کی کشمکش شمال کے عیسائی حکمرانوں سے شروع ہوگئی۔ استعمار کے خلاف جدوجہد آزادی میں مسلمانوں کا درخشاں کردار ہے لیکن فلپائن کی تاریخوں میں اس کا تذکرہ تک نہیں کیا جاتا۔ حال ہی میں قومی ہیرو جوزے ریزال (JOSE RIZAL) کو اسپینیوں کے پھانسی دینے (۱۸۹۶) کے سو سال پورے ہونے پر ایک تقریب میں موجودہ معاہدہ کے پس منظر میں یہ توقع ظاہر کی گئی ہے کہ شاید اب مسلمانوں کو فلپائن کی تاریخ میں ان کا جائز مقام ملے۔ لیکن کیا واقعی ایسا ہوگا؟ عیسائی حکمرانوں نے مسلمانوں کو جائز مقام دینے کی بجائے انھیں مغلوب کرنے کی پالیسی اختیار کی' ان کے علاقوں میں عیساؤں کی آبادکاری کی مہم چلائی۔ ظلم و زیادتی کی بھی کوئی حد نہ تھی۔ ۱۹۶۸ میں حکومت نے کچھ مورو ساتھ ملا کر ملائیشیا کے علاقے صباح پر حملے کا منصوبہ بنایا' جو طشت ازبام ہونے پر خفیہ رکھنے کے لیے پوری کمپنی کو قتل کر ڈالا۔ ایک زندہ بچ جانے والے نے پورا واقعہ بیان کیا۔ اس واقعہ کے بعد شمال جنوب کے تعلقات بہتر ہونے کے راستے مسدود ہوگئے۔ ۷۰ کے عشرے میں عالم اسلام کے واقعات کے اثرات یہاں بھی ہوئے۔ ۱۹۶۹ میں مورو نیشنل لبریشن فرنٹ قائم کی گئی۔ انھوں نے جہاں سے بھی ممکن ہوا گوریلا جنگ کی تربیت اور مدد حاصل کی۔ معمر قذافی ان کے خاص سرپرست بن گئے جنھوں نے درمیان میں پڑ کر خود مختاری کے لیے تریپولی معاہدہ بھی کروایا جس پر عمل نہ ہو سکا۔ لبریشن فرنٹ کو وہ تمام مسائل درپیش تھے جو ایسی تحریکوں کو ہوتے ہیں' یعنی مرکزی قیادت کا نہ ہونا' کمزور تنظیم' ہمیشہ اصل سیاسی دھارے کے کنارے پر رہنا' حمایت کا بہت عام نہ ہونا' مالی وسائل مسلسل اور مستقل فراہم نہ ہونا۔ آپس کے انتشار سے بھی کمزوری پیدا ہوئی۔ ۱۹۸۷ میں سلامت ہاشم نے علیحدہ ہو کر مورو اسلامک لبریشن فرنٹ قائم کی۔ اس کا مزاج زیادہ قدامت پسند اور "اسلامی" ہے اور مسوری کو ان کے مقابلے میں "سیکولر" کہا جا سکتا ہے اور غالباً اسی لیے صدر

راموس نورمسوری کو آگے لانا چاہتے ہیں۔ اسلامک فرنٹ کا مطالبہ مسلمان علاقوں میں اسلامی حکومت کا قیام ہے۔ جہاد کا علمبردار ایک ابوسیاف گروپ ہے جو ایجنسیوں کی تخلیق بھی ہو سکتا ہے۔

کوئی متحدہ محاذ نہ ہونے کی ایسی صورت حال میں معاہدے پر دستخط ہوئے ہیں، ۱۹ اگست کو راموس نے اعلان کیا کہ ایم این ایل ایف سے مسلح جنگ کا اختتام ہو گیا ہے اور ۲ ستمبر کو انھوں نے اور نورمسوری نے منڈاناؤ معاہدہ پر دستخط کر دیے۔ کیا یہ معاہدہ مسلمانوں کو سیاسی اور معاشی طور پر فلپائن کے نظام میں برابری اور عزت کا مقام دے گا؟ اس وقت معاہدہ کے حوالے سے سینٹ میں ۱۲ قوانین کے مسودے زیر بحث ہیں۔ [ایک میں ان علاقوں کا نظام تعلیم زیر بحث ہے] ان مسودات جو بحث ہوگی اور موقف اختیار کیا جائے گا، اس سے مسلمانوں کو مستقبل کا اندازہ ہوگا۔

دراصل حقیقی مسئلہ تو حقوق اور عدل و انصاف کا ہے، اور ہم پاکستانی اس کو بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ چند مسلمانوں کو اختیارات اور عہدے دے کر یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں سمیت سب کے کلچر، تاریخ اور ضروریات کا قرار واقعی احساس کیا جائے۔ مرکزی حکومت ماضی کی تلافی کے جذبے سے آگے بڑھ کر مسلمانوں کو مرکزی دھارے میں لائے، مرکز میں ان کی واضح موجودگی کو یقینی بنایا جائے۔ جھنڈے میں تبدیلی کا مطالبہ مان لینے میں ہرج نہ سمجھا جائے کہ اس کی علامتی اہمیت ہے۔ باہمی اعتماد کی فضا صدیوں کی بد اعتمادی کو دور کرنے کے طرف پہلا قدم ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر منیلا کے صاحبان اقتدار کی درپردہ خواہش یہی ہو کہ مسلمانوں کو ان کے حقوق نہ دیے جائیں تو صورت حال سلجھنے کے امکانات کم ہو جائیں گے۔ علاقے کے ممالک اور او آئی سی کو یہ کردار ادا کرنا چاہیے کہ اس معاہدہ پر مکمل عمل کی ضمانت حاصل ہو۔ مسائل حل کرنے کے لیے معاہدات کی حکمت عملی اسی صورت میں نتیجہ خیز ہو سکتی ہے کہ نیت نیک ہو۔ اگر مقصد ایک گروپ کو ساتھ لے کر اس کی ساکھ مجروح کرنا، اسے اپنوں کی نظر میں بدنام کرنا، جو وعدے کیے جائیں وہ بھی نہ دینا اور اس کی بنیاد پر دوسرے گروپوں کو کچلنا ہو، اور پھر اس کے کمزور ہو جانے پر اسے بھی کچلنا ہو تو یقیناً ایسے معاہدات آئندہ کے راستے بھی مسدود کریں گے۔ نورمسوری نے عملیت پسند ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے بہت اندیشے مول لے کر دستخط کیے ہیں۔ فلپائن کے حکمرانوں کو بدلتے وقت کا احساس کرنا چاہیے، مسلمانوں کو برابر کا مقام اور حقوق دینا چاہییں، وسیع ظرف کا ثبوت دینا چاہیے اور مذہبی تعصبات کو بالائے طاق رکھ دینا چاہیے۔ صد سالہ تقریبات کے موقع پر فلپائن کے ایک ہوٹل میں اذان کی آواز مسلمانوں کے لیے یہ پیغام تھی کہ وہ ابھی یہیں تک پہنچے ہیں۔ فلپائن میں برابر کا حصہ دار ہونے کی جدوجہد جاری ہے۔

(ماخوذ: ماہنامہ اسپیکٹ، لندن۔ اکتوبر ۹۶)

اوسلو معاہدے کے بعد

عزام تمیمی، مسلم سجاد

مسجد اقصیٰ میں سرنگ کھودنے کی اسرائیلی کارروائی اور اس پر فلسطینیوں کے ردعمل نے معاہدہ امن کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ ۱۳ ستمبر ۹۳ کو عرفات اور رابن نے صدر کلنٹن کے سامنے جس اوسلو معاہدے پر دستخط کیے تھے اس کی تیسری سالگرہ منانے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ جس معاہدے سے امن و خوشحالی کے نئے دور کے آغاز کی امیدیں لگائی گئی تھیں، اس نے بالکل معکوس نتائج سامنے لاکر رکھ دیے ہیں۔ اسرائیل کی ریاست کی سلامتی پہلے سے زیادہ یقینی نہیں ہوگئی ہے۔ عرفات شاید اپنے غیر مقبول ہونے کا اس سے زیادہ خوفناک تصور نہ کر سکتا تھا۔ فلسطینی عوام اسرائیل کے براہ راست قبضے کے مقابلے میں فلسطینی اتھارٹی (PNA) کے ماتحت زیادہ درماندہ ہیں اور زیادہ ظلم اور عذاب سہہ رہے ہیں۔ اسرائیل کی جیلوں میں ۴ ہزار اور فلسطینی ریاست کی جیلوں میں ایک ہزار فلسطینی جوان تعذیب کا شکار ہیں۔ علاقے میں امن کے دشمنوں سے نبٹنے کے نام پر آزادی کے بجائے ظلم و جبر کا دور جاری ہے۔

غریب اور امیر کا فرق پہلے سے زیادہ خوفناک ہوگیا ہے۔ آبادی کے بہت بڑے حصے کو دو وقت کی روٹی میسر نہیں آرہی ہے، جب کہ معاہدے کے وقت بہتر مستقبل کے وعدے کیے گئے تھے۔ مغربی کنارے، اور غزہ میں جو نیا حکمران طبقہ وجود میں آیا ہے، سیاست کے ساتھ تجارت کے ذریعے پہلے ہی سے محدود وسائل کو مزید لوٹنے میں حصہ دار بن گیا ہے۔

اوسلو معاہدے کا سب سے بڑا "کارنامہ" یہ ہے کہ تیس ہزار نفری کی پولیس فورس بنی ہے جو سات ایجنسیوں پر مشتمل ہے اور ہر ایک کے اپنی سطح کی اسرائیلی ایجنسی سے خصوصی روابط ہیں۔ پولیس یہ یقینی بناتی ہے کہ قومی تعمیر کے اس دور میں کوئی شخص نہ آزادی سے حرکت کرے، نہ بولے اور نہ سوچے!

جن لوگوں نے امن کے ہیرووں کا شادیانے بجاکر استقبال کیا تھا انہیں بہت جلدی اس شجر خبیث کے کڑوے کسیلے پھل چکھنا پڑ گئے ہیں۔ جن کوٹھڑیوں میں اسرائیلی، انتفاضہ کے نوجوانوں کو ٹارچر کرکے شہید کر دیتے تھے، وہیں وہی کام عرفات کے آدمی کر رہے ہیں، اس لیے نہیں کہ انتفاضہ ان کے لیے چیلنج ہے، بلکہ محض اس لیے کہ وہ اسرائیل کو دکھا سکیں کہ وہ بھی یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ تاریخی معاہدے کا یہ دی تقاضا جو ٹھہرا!۔ عرفات کی پالیسی سے صرف مخالفت ختم نہیں کی جارہی ہے بلکہ اعلیٰ اقدار کا حامل وہ معاشرہ بھی تباہ و برباد ہو رہا ہے جو اسرائیل سے کشمکش کے نتیجے میں قدرتی

طور پر وجود میں آگیا تھا۔

اسرائیل اور عربوں کے درمیان جو مسائل لاینحل تھے، وہ اب بھی اسی طرح ہیں اور کسی بہتری کے آثار نہیں۔ مہاجرین کا مسئلہ، بیت المقدس کی حیثیت کا مسئلہ، یہودی آبادیوں کا مسئلہ، فلسطین کی خود مختاری کا مسئلہ۔ ۵۰ لاکھ سے زیادہ فلسطینی دربدر ہیں۔ بیت المقدس ملنے کا سوال ہی نہیں ہے، بہت سے بہت شہر سے باہر جھنڈا لگانے کی اجازت مل سکتی ہے۔

نیتن یاہو نے اقتدار سنبھالتے ہی یہودی آبادکاری پر سے پابندی اٹھادی، اب ان میں سے بعض میں دس گنا تک اضافہ ہو رہا ہے۔ ساتھ ہی الخلیل میں چند آبادکاروں کے ہاتھوں میں، ایک لاکھ فلسطینی یرغمال ہیں۔

جو علاقے فلسطینیوں کو دیے گئے ہیں وہاں وہ قصبات میں سکول چلا سکتے ہیں، ڈاک کے ٹکٹ جاری کر سکتے ہیں، لیکن اقتدار اعلیٰ صرف اور صرف اسرائیل کا ہے۔ شاہراہوں پر ان کا عمل دخل نہیں۔ مغربی کنارے اور غزہ کے پورے علاقے میں کوئی بھی عرب، حتیٰ کہ عرفات بھی اسرائیل کی اجازت کے بغیر نقل و حرکت نہیں کر سکتا۔ کوئی عمارت تعمیر کرنے کے لیے اور کنواں کھودنے تک کے لیے اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔ فلسطینی پارلیمنٹ کوئی قانون منظور نہیں کر سکتی جب تک پہلے اسے اسرائیل سے منظوری نہ لے لی ہو۔ پی این اے کو صرف ظلم و تشدد کا کھلا لائسنس دیا گیا ہے۔

اس معاہدے سے کس کو کیا ملا ہے؟ سب سے زیادہ نقصان میں فلسطینی ہیں، لیکن شاید عارضی دور کے لیے۔ فلسطین کا مسئلہ حل ہونے کا ابھی دور دور تک امکان نہیں ہے، لیکن کئی مسلم اور عرب ممالک کے دروازے اسرائیل کے لیے کھل گئے ہیں۔ مقامی سطح پر اپنا نقصان اسرائیل نے علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر پیش قدمی کر کے پورا کر لیا ہے۔ قطر، اور اومان، تیونس، مراکش اور ماریطانیا سے تجارتی اور سفارتی تعلقات نے اسرائیل کے مفادات کو تقویت پہنچائی ہے جب کہ فلسطینیوں کی پوزیشن کمزور ہوئی ہے، ان کے لیے عوامی حمایت اور اس کے اظہار میں بھی واضح کمی آئی ہے۔

اس دور کا ایک نمایاں عمل اسرائیل اور ان متعدد عرب اور مسلم ممالک کی ایجنسیوں میں قریبی روابط ہیں جو اسلامی بیداری کی لہر کو اپنے تخت کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ بہرحال امریکہ اور یورپی حلیفوں کی مدد سے کامیابیوں کے باوجود، آخری نقصان اسرائیل کا ہی ہے۔ صیہونیوں کا مسلم ممالک میں کوئی دوست نہیں۔ سب ہی مسلمان ان پر نفرین بھیجتے ہیں اور اس دن کی تمنا کرتے ہیں جب وہ اپنی زنجیریں توڑ کر بیت المقدس کو آزاد کروا سکیں۔ اگر اسرائیلی قیادت دور اندیش ہوتی تو وہ مسلمانوں کے دل میں جگہ بنا سکتی تھی، لیکن اس نے کوتاہ بینی کا ثبوت دیتے ہوئے ایک ارب سے زاید مسلمانوں کی دشمنی مول لے لی ہے۔

رسائل و مسائل

ا۔رشتے داروں سے پردہ

۲۔ مشترک خاندانی نظام اور اسلام

میری شادی ایک تحریکی گھرانے میں ہوئی ہے اور میں بھی الحمد للہ تحریک سے وابستہ ہوں۔امی ابو کا خاندان اور سسرالی خاندان دونوں ہی متوسط مذہبی طبقہ فکر سے ہیں۔ مجھے آپ سے دو امور میں راہنمائی لینا ہے۔امید ہے کہ آپ کا جواب میری طرح کی اور بہت سی لڑکیوں کے لیے مددگار ثابت ہوگا۔

میرا پہلا سوال پردے کے حوالے سے ہے۔کیا تمام غیر محرم رشتے داروں سے چہرے کا پردہ شرعاً واجب ہے؟ میں شادی سے پہلے پردہ تو کرتی تھی لیکن غیر محرم رشتے داروں سے چہرے کا پردہ نہیں کرتی تھی۔نہ تو مخلوط محفلیں تھیں نہ ہی بے تکلفی، لیکن سامنے آکر دعا سلام کرنا اور خیریت دریافت کرنے کا اہتمام ہوتا تھا۔شادی کے بعد میرے گھر والوں نے مکمل شرعی پردے کا ارادہ کرتے ہوئے اس چیز کا اہتمام کیا کہ سب غیر محرم رشتہ داروں سے چہرے کا پردہ ہوگا۔اس سے پہلے خاندان میں ایسا نہیں تھا لہٰذا شدید اختلافات پیدا ہوئے۔ میرے میکے اور سسرال دونوں طرف سے خاصے نکات اٹھائے گیے، مثلاً یہ کہ چچا، خالو، اور ماموں وغیرہ سے بھی پردہ ہے وہ کیوں نہیں کیا جاتا وغیرہ۔ اور یہ بھی کہ امی کے گھر اپنے کزنز اور والدین کے کزنز سے نہیں کیا جاتا تو یہاں کیوں کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اب میری پوزیشن بڑی عجیب ہے۔ پردے کا موضوع رفتہ رفتہ تضحیک کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اسلام و غیر اسلام کی بحث بن کر رہ گیا ہے۔ خاندان کی طرف سے ایک قسم کے سوشل بائی کاٹ کا سامنا ہے۔حتیٰ کہ میرے میکے والے بھی اسی بنا پر گھر آنے سے کتراتے ہیں۔ زیادہ مسئلہ اس لیے بھی درپیش ہے کہ سسرالی رشتے دار بھی بہت قریب اور کھلے ملے ہوئے ہیں۔ایسے میں عجیب سی تنہائی (isolation) کی کیفیت ہے۔

میرے لیے اپنی ذاتی رائے کا اظہار کرنا بھی مشکل ہے اور دوسروں یعنی بڑوں کی رائے پر پورا اترنا بھی محال۔ براہ مہربانی آپ وضاحت سے بتائیں کہ اسلام اس سلسلے میں ہمیں کیسی اور کتنی گنجایش دیتا ہے۔

میرا دوسرا سوال "مشترکہ فیملی سسٹم" کے بارے میں ہے۔ ایک طرف اسلام ایک مکمل خاندانی نظام کی تشکیل کرواتا ہے جس میں غیر محرم رشتہ داروں سے بے تکلفی کی ممانعت، زینت کے اظہار کی ممانعت، شوہر کی دلجوئی، بچوں کی مکمل تربیت وغیرہ لیکن دوسری طرف یہ سارے امور مشترکہ فیملی میں ادا ہونے ناممکن ہیں۔ یہ چیز معاشرے میں ایسی ہو گئی ہے کہ دیندار گھرانے بھی عورت کی طرف سے کسی ایسے مطالبے کو معیوب سمجھتے ہیں۔ اس نظام کی سب سے زیادہ زد عورت کی شرم و حیا پر پڑتی ہے۔ غسل جنابت، شوہر سے بے تکلفی، حمل کے دوران بہت سے ظاہری و باطنی معاملات کا چھپانہ رہنا وغیرہ۔ ایسی بہت سی باتیں ازدواجی زندگی میں حد درجہ گھٹن اور بندش پیدا کرتی ہیں۔ مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ کیا علیحدہ گھر عورت کا شرعی حق ہے۔؟ اگر اس کا انتظام بہ سہولت ہو سکتا ہو تو کیا وہ اس کا مطالبہ کر سکتی ہے؟ اور وہ کون سے حالات ہیں جن میں سسرال والے اسے اس حق سے محروم کر سکتے ہیں؟۔

پتا نہیں دینی احکام میں غلو اور معاملات میں ان کے حقوق کی ادائیگی سے غفلت و لاپرواہی کی وجہ سے عورتیں کب تک تکلیفیں اٹھاتی رہیں گی۔ آپ نے جو دو مسائل پیش کیے ہیں ان کے بارے میں اپنے علم کے مطابق اپنی رائے لکھ رہا ہوں۔ لیکن صرف صحیح بات معلوم کرنے سے مسائل حل نہیں ہو جایا کرتے، خصوصاً عورت کے، جو ہر معاشرے میں کمزور اور مظلوم ہے۔

پہلا مسئلہ غیر محرم رشتہ داروں سے چہرے کے پردے کا ہے۔ مثلاً دیور، بہنوئی، اپنے اور شوہر کے کزن، دونوں کے والدین کے کزن، رشتے کے بھتیجے اور بھانجے۔

۱۔ میرے علم کی حد تک ایسے غیر محرم رشتہ داروں سے چہرے کا پردہ کرنا ضروری نہیں ہے، نہ ایسا کوئی شرعی حکم ہے، جن کے ساتھ خاندانی روابط اور تعلقات ہوں، میل جول ہو، اور گھروں میں آنا جانا ہو، اور ہونا چاہیے۔ حضرت اسماءؓ حضورؐ کی سالی تھیں، حضرت ام ہانیؓ آپ کی چچازاد بہن، دونوں آپؐ کے سامنے آتی تھیں اور کم از کم منہ اور چہرے کا پردہ دونوں نے آپؐ سے آخر وقت تک بھی نہیں کیا۔ اس قسم کے رشتوں میں، بلکہ اس سے کچھ وسیع تر دائرے میں بھی، چہرے کے پردے کے بغیر سامنے آنے کے اور بکثرت نظائر موجود ہیں، جن کو جمع بھی کر دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس بھی نظائر موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مخصوص حالات میں کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ اگرچہ مولانا مودودیؒ نے بڑے مضبوط استدلال کے ساتھ ان فقہا کی رائے کو صحیح قرار دیا ہے جن کے نزدیک عورت کا چہرہ حجاب میں داخل ہے اور وہ کسی شدید ضرورت کے تحت ہی اسے اجنبیوں کے سامنے کھول سکتی ہے، لیکن غیر محرم رشتہ داروں سے پردے کے بارے میں ان کی

رائے بھی یہی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ ایسے رشتہ دار نہ تو محرم رشتہ داروں کے حکم میں ہیں کہ عورتیں بے تکلف ان کے سامنے زینت کے ساتھ آئیں، اور نہ بالکل اجنبیوں کے حکم میں کہ عورتیں ان سے ویسا ہی مکمل پردہ کریں جیسا کہ غیروں سے کیا جاتا ہے۔ (تفہیم، ج ۴، ص ۲۸۸)۔

۳۔ اس اجازت کی حکمت و مصلحت کو سمجھنا کچھ دشوار نہیں۔

اولاً خاندانی روابط کو جوڑ کر رکھنا، ان میں مہر و محبت کی روح کو برقرار رکھنا شریعت کے اعلیٰ ترین مقاصد اور اہم ترین احکام میں سے ہے۔ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اس کو کاٹنا بڑا گناہ ہے۔ (البقرہ، الرعد) اور اس کو جوڑے رکھنا بہت بڑی نیکی (الرعد) حضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص چاہتا ہے کہ اس کے رزق میں کشادگی کی جائے وہ صلہ رحمی کرے۔ مسلمانوں میں خاندان صرف میاں بیوی تک محدود نہیں، مغرب کی نیوکلیر فیملی کی طرح، بلکہ اس میں تمام اعزا و اقارب شامل ہوتے ہیں جن سے رحم کا رشتہ ہوتا ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ غیر محرم رشتہ داروں سے چہرے کا پردہ کرنا قطع رحمی ہے۔ لیکن جہاں اپنے پھوپھا اور خالو اور والدین کے پہلے کزن ---- جو قریب ترین اقربا ہیں ---- ان کو دیکھا نہ ہو، نہ ان کے ساتھ بیٹھے ہوں، نہ کھانا ساتھ کھایا ہو، نہ کبھی بات چیت کی ہو، تو ان سے تو اس درجے کے تعلقات بھی نہیں ہو سکتے جس درجے کے دوستوں اور ساتھ کام کرنے والوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔ پھر اس کا نتیجہ تعلقات کے سرد پڑ جانے یا منقطع ہو جانے کے علاوہ کچھ نہیں۔ شریعت میں پردے کا حکم فتنوں سے تحفظ کے لیے دیا گیا ہے نہ کہ اس کے مطلوب مقاصد کو نقصان پہنچانے کے لیے۔

ثانیاً اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری سپرد کی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ حق قریبی رشتے داروں کا بنتا ہے۔ وانذر عشیرتک الاقربین پھر خاص طور پر وہ مسلمان مرد اور عورتیں جو دین کو اپنی زندگی کا مقصد بنا چکے ہوں، اور انھوں نے دعوت و اصلاح اور غلبہ دین کی جدوجہد کا بیڑا بھی اٹھایا ہو، وہ اپنے رشتے داروں کے درمیان یہ کام کیسے کر سکتے ہیں اگر تمام غیر محرم رشتے داروں سے چہرے کا پردہ شرعاً لازم ہو۔

۴۔ ان غیر محرم رشتے داروں سے پردہ کی حدود کیا ہیں؟ زینت کے ساتھ سامنے نہ آنے کا حکم تو واضح ہے۔ اس کے آگے، مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں "ٹھیک ٹھیک رویہ کیا ہونا چاہیے یہ شریعت میں متعین نہیں کیا گیا، کیونکہ اس کا تعین ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے حدود مختلف رشتے داروں کے معاملے میں ان کے رشتے، ان کی عمر، عورت کی عمر، خاندانی تعلقات و روابط اور فریقین کے حالات (مکان کا مشترک ہونا یا الگ الگ مکانوں میں رہنا) کے لحاظ سے لامحالہ مختلف ہوں گے اور ہونے چاہییں۔"

شریعت کا مقصد فتنے کے امکانات کو کم کرنا ہے۔ جہاں فتنے کا امکان جتنا زیادہ اور قوی ہو وہاں اتنی ہی زیادہ احتیاط کرنا ہوگی۔ مولانا مودودیؒ نے جو بات اجنبیوں کے ساتھ چہرہ کھولنے کے بارے میں کہی ہے وہی بات اس معاملے پر بھی صادق آتی ہے۔ ایک مومن عورت جو خدا اور رسولؐ کے احکام کی سچے دل سے پابند رہنا چاہتی ہے، اور جس کو فتنے میں مبتلا ہونا منظور نہیں، وہ خود اپنے حالات اور ضروریات کے لحاظ سے فیصلہ کر سکتی ہے کہ کیا رویہ اختیار کرے۔ بعض حالات میں وہ محرم رشتے داروں سے بھی الگ رہ سکتی ہے، بعض صورتوں میں وہ غیر محرم کو گھر میں آنے کی اجازت دینے سے بھی انکار کر سکتی ہے، اور بعض حالات میں وہ بے تکلفی کے ساتھ ان کے ساتھ بیٹھ کر بات چیت کر سکتی ہے، کھاپی سکتی ہے۔

۵۔ میری فہم کی حد تک اصول یہ بنے گا کہ ان غیر محرم رشتہ داروں جن کے ساتھ میل جول اور آنا جانا ہے یا ہونا چاہیے، یا جو ساتھ رہتے ہیں، آپ چہرے کے پردے کے بغیر ان کے سامنے آسکتی ہیں، الا یہ کہ کہیں حالات اس کے برخلاف تقاضا کریں۔ اس معاملے میں اصل فیصلہ کن اصول صلہ رحمی کی خاطر اور دعوت و اصلاح کی خاطر بھی، خاندانی روابط و تعلقات کو خوش گوار اور مہر و محبت پر مبنی رکھنا ہے، یا خود کو فتنے کے حقیقی امکانات سے بچانے کا۔

۶۔ اس معاملے میں فیصلے کا اختیار صرف عورت اور اس کے شوہر کو حاصل ہے۔ اس لیے کہ شریعت نے کوئی چیز متعین کر کے نہیں دی ہے، اور اسی لیے نہیں دی ہے کہ حالات کے مطابق فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اور اس فیصلہ کا اختیار اسی کو حاصل ہوگا جس کو خدا کے سامنے اپنے عمل اور اس کے نتائج و عواقب کی جواب دہی کرنا ہے۔ شوہر اس لیے شریک فیصلہ ہے کہ گھر دونوں کا ہے، آنا جانا سب عموماً ساتھ ہو سکتا ہے۔ اس لیے یہ فیصلہ آپ کو اور آپ کے شوہر کو باہمی رضامندی اور مشورے سے کرنا چاہیے کہ کس سے کتنا پردہ کرنا ہے۔

۷۔ باہمی رضامندی اور مشورے کی بات میں نے اس لیے کہی کہ قرآن کا حکم مشاورت، وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ تمام اجتماعی معاملات پر محیط ہے۔ اور بعض خاندانی معاملات میں قرآن نے خاص طور پر عن تراض منهما و تشاور کو ضروری قرار دیا ہے۔

۸۔ کیونکہ حدود کا تعین حالات کے لحاظ سے ہوگا، اسی لیے یہ ممکن ہے کہ بیوی اور شوہر ایک ہی درجے کے رشتے داروں میں سے کسی کے ساتھ چہرے کا پردہ کرنے کا، اور کسی کے سامنے بالکل نہ آنے کا، اور کسی کے سامنے بغیر زینت کے اپنائیت کے تقاضے پورے کرتے ہوئے سامنے آنے کا فیصلہ کریں۔ اس پر دوغلے پن کا الزام وارد کرنا کسی طرح صحیح نہیں۔

۹۔ کیونکہ فیصلے کا اختیار شوہر اور بیوی کو ہے، اس لیے کسی بھی دوسرے کو--- وہ تحریکی ساتھی

صاحب امر ہو' میکے کا رشتے دار ہو' سسرالی رشتے دار ہو' یہ حق اور اختیار نہیں پہنچتا کہ وہ عورت پر پابندی عاید کرے کہ جہاں شریعت نے پابند نہیں کیا وہاں وہ چہرے کا پردہ کرے۔

۱۰- جو لوگ تمام غیر محرم رشتے داروں سے چہرے کے پردے کو حکم شرعی قرار دیتے ہیں' میرے خیال میں ان کا یہ فتویٰ دین میں غلو کے مترادف ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ دین میں غلو یہی ہے کہ جس چیز کو شریعت نے پابند نہیں کیا اس چیز کو شریعت کے نام پر پابند کر دیا جائے' جس چیز کو مباح کیا ہے اس کو حرام کر دیا جائے۔ اس غلو سے شدت کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔ حضورؐ نے کہا ہے کہ "تشدد نہ اختیار کرو' سہولت اور نرمی کرو' میانہ روی اختیار کرو' میانہ روی"۔ قرآن نے کہا ہے کہ: لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ۔ غلو' شاہ ولی اللہ صاحب نے کہا ہے' تحریف دین کے بنیادی اسباب میں سے ہے۔ میں کہتا ہوں کہ صرف تحریف فی الدین ہی نہیں' انحراف عن الدین کا بھی بنیادی سبب ہے۔ کیونکہ لوگ ان احکام کا بار نہیں اٹھا سکتے۔ چنانچہ وعظ و کتاب میں کچھ اور ہوتا ہے اور عمل میں اس سے انحراف۔ اچھے اچھے دین دار لوگوں اور علما کے گھرانوں میں بھی تمام غیر محرم رشتے داروں سے چہرے کا پردہ نہیں کیا جاتا۔

اسی غلو کی ایک علامت سگے ماموں اور چچا تک سے چہرے کا پردہ کرنے کا فتویٰ ہے۔ کتابوں میں پڑھا تھا' اب یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ عملاً بھی اس کا تقاضا ہوتا ہے۔ مولانا اصلاحی نے تدبر قرآن میں (ج ۵' ص ۳۹۷) اور مولانا مودودیؒ نے تفہیم القرآن میں (ایضاً' ص ۳۸۸) میں واضح کر دیا ہے کہ اگرچہ ان کا ذکر سورۃ نور کی اس آیت میں نہیں ہے جس میں اظہار زینت سے مستثنیٰ افراد کا ذکر ہے' لیکن یہ بھی ان کے حکم میں شامل ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے: "محرم اعزہ کے نمایاں عناصر کے نام گنا دیے گئے ہیں لیکن مراد وہ سب لوگ ہیں جو اس حکم میں داخل ہیں (تدبر قرآن)

اسی غلو کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ آج شرعی حکم ہے' کل زمانہ خود اسے شریعت سے خارج کر دیتا ہے۔ مجھے بچپن کا یاد ہے کہ ہماری عورتیں گھر سے نکلتی تھیں تو دروازہ سے سواری تک پردہ باندھا جاتا تھا' پھر تانگے یا موٹر میں بھی پردہ باندھا جاتا تھا' پھر اس کے اندر وہ برقعہ پہن کر بیٹھتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اسے حکم شرعی ہی سمجھتی ہوں گی۔ اب یہ سوائے دور دراز کے چند علاقوں میں شاید ایک خواب و خیال ہو گیا ہے۔ اس کے برعکس اب دین دار برقعہ پوش خواتین موٹر سائیکل پر پیچھے بیٹھ کر نکلتی ہیں۔

مباح اشیا کو ممنوع و حرام کے دائرے میں لانے کا غلو بہت عام ہے۔ بعض لباسوں پر' رسومات پر' انسانی فطرت کے مطابق خوشیاں منانے کے طریقوں پر--- حتیٰ کہ سیاست و معیشت کے دائروں میں بھی۔ ناجائز' ناپسندیدہ' حرام اور کفر کے فتاویٰ کا آج جو عام چلن ہے وہ اس غلو کا نتیجہ ہے۔

حالانکہ حضورؐ نے واضح فرمایا کہ "واجبات واضح ہیں حسب استطاعت بجالاؤ واضح ہیں، ترک کر دو، حدود کے اندر رہو، اور جہاں اللہ تعالیٰ نے خاموشی اختیار کی ہے---- اس لیے نہیں کی کہ اس سے چوک ہوگئی یا وہ بھول گیا---- وہ تمھارے اوپر رحمت کی خاطر کی ہے۔ اس کی کھوج کرید میں نہ پڑو۔ فرمایا "وہ بہت بڑا مجرم ہے جس کے سوال اور کھوج کرید کی وجہ سے ایسی چیز ممنوع و حرام ہو جائے جو نہیں ہے"۔

آپ جیسی دین پسند عورتیں اگر دین کو پھر "الیسریٰ" کی صورت میں پیش کرنے میں کامیاب ہو جائیں، تو ان شاء اللہ اس کا امکان ہو گا کہ ۲۱ویں صدی کی مسلمان عورت مسلمان رہ سکے گی۔

دوسرا مسئلہ مشترک اور علیحدہ گھر کا ہے۔ دینی احکام کی حد تک یہ بہت آسان مسئلہ ہے۔ چہرے کے پردے کے مسئلے کی طرح اس بارے میں کوئی اختلافات بھی خاص نہیں۔ عورت کے نان نفقہ کے حق میں یہ حق شامل ہے کہ اگر وہ علیحدہ گھر چاہتی ہو اور رشتہ داروں کے ساتھ مل جل کر نہ رہنا چاہتی ہو، تو شوہر کے لیے اس کا علیحدہ گھر میں، یا مشترک گھر میں علیحدہ میں رکھنا ضروری ہے۔ مجھے اس وقت حوالوں کے لیے کتابیں دستیاب نہیں ہیں۔ مولانا تھانویؒ کی حقوق و فرائض پر کتابوں میں بھی یہ مسئلہ موجود ہے، اور مولانا سلطان احمد اصلاحی نے اس موضوع پر ایک بہت عمدہ کتاب لکھی ہے جس میں قرآن و سنت، عہد نبویؐ کے تعامل کے نظائر اور فقہاء کی آراسب جمع کر دی ہیں۔ یہ کتاب بھارت اور لاہور سے شائع ہو چکی ہے اور آپ کو بہ آسانی مل جائے گی۔

عورت علیحدہ گھر صرف اس لیے بہت چاہتی ہے کہ وہ شوہر کے رشتے داروں کے ساتھ مل جل کر رہنا نہیں چاہتی۔ جہاں شوہر کے رشتے دار اس کو ایذا پہنچا رہے ہوں، وہاں تو شریعت کے احکام کے تحت بدرجہ اتم یہ حق بنتا ہے کہ اسے علیحدہ گھر دیا جائے۔ لیکن ایذا رسانی نہ ہو، اور ساتھ مل کر رہنا چاہتی ہو، تو صرف عورت کی زندگی میں اور اپنے شوہر اور اپنے بچوں سے تعلقات کے دائرے میں اس کی بے شمار ضرورتیں، مشکلات، مسائل، اور نزاکتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے الگ گھر کو نان نفقہ کا حصہ بنایا گیا ہے۔ پھر اگر مشترک گھر میں غیر محرم رشتے دار رہتے ہوں تو اس کی زندگی اجیرن ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ بے شک وہ اس کے سامنے منہ کھلا کر کے آسکتی ہے، لیکن وہ گھر میں کسی وقت بھی زینت نہیں کر سکتی، نہ اسے ظاہر کر سکتی ہے۔ حالانکہ یہ اس پر اس کے شوہر کا حق بھی ہے۔ صرف محرم رشتے دار جب بھی شوہر سے تعلقات میں اور زمانہ حمل میں بے شمار پرائیویٹ پہلو ہوتے ہیں جن کو وہ شرم و حیا کی وجہ سے آشکار کرنا پسند نہیں کر سکتی، لیکن مشترک گھر میں، خصوصاً و اگر تنگ بھی ہو، ان کو آشکار ہونے سے روک بھی نہیں سکتی۔ شوہر کے والدین یا رشتے داروں کے کسی خاص انسانی

مسائل کی وجہ سے عورت خود ہی حسن سلوک کر کے ساتھ رہنا چاہے تو یہ الگ بات ہے۔

معاشی وجوہات سے اگر شوہر کے لیے الگ گھر یا الگ حصہ دینا ممکن نہ ہو، تو کم سے کم اسے استیذان کے سارے احکام پر عمل درآمد کے سلسلے میں اپنی بیوی کے حقوق کا مکمل اہتمام کرنا چاہیے، جب تک حصہ یا گھر الگ نہ کر سکے۔

یہ بدقسمتی ہے کہ اکثروبیش تر تو مسلمان گھروں میں، دین دار گھروں میں بھی، عورت کے حقوق کا نہ علم پایا جاتا ہے نہ ادراک، نہ ان کو معلوم کر کے ان کو ادا کرنے کی فکر۔ معاملات و حقوق کے معاملے میں عموماً بڑی غفلت اور لاپرواہی ہے۔ عورت مجبور اور زیردست ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی اس غفلت کا شکار رہتی ہے۔ عملاً وہ کچھ کر بھی نہیں سکتی۔ زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ گھرانے جو ساری روئے زمین پر شریعت کے نفاذ اور ظلم کے ازالے کے لیے رات دن وظیفہ پڑھتے ہیں، وہ اپنے گھر کی حدود میں، جہاں ان کو اختیار واقتدار حاصل ہے، شریعت کو نافذ کرنے کے روادار نہیں ہوتے۔

میں نے اپنے علم اور دوسرے قابل علما کی آرا کے مطابق ان دونوں معاملات میں وہ بات لکھ دی ہے جو میرے نزدیک صحیح ہے۔ والعلم عند اللہ تعالٰی ، و اللہ اعلم بالصواب۔ میرا مقام مفتی کا نہیں، میں تو صرف مشورہ دے سکتا ہوں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ صرف علم، شوریٰ اور فتویٰ سے اس قسم کے مسائل حل نہیں ہوجاتے۔ عورت کی پوزیشن بہت کمزور ہوتی ہے۔ اگر وہ کہے کہ میں پردہ کرنا چاہتی ہوں، یا نہیں چاہتی، اور گھر کے بڑے یا شوہر اس کے مخالف ہوں، تو وہ کیسے اپنے فیصلے پر عمل کرے۔ ظاہر ہے کہ ان کی خاطر وہ اپنے گھر کے امن و سکون کو برباد نہیں کر سکتی، شوہر سے مستقل تنازع اور ناچاقی مول نہیں لے سکتی، اور ازدواج کا بندھن توڑنے کا خطرہ تو ہرگز بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ یہی صورت مشترک گھر میں رہنے اور علیحدہ گھر کے مطالبے کی صورت میں بنتی ہے۔

دراصل ان معاملات میں اصل کلید تو شوہر ہے۔ اگر شوہر کو اللہ اور اس کے رسول کے دیے ہوئے حقوق کی ادائیگی کی فکر ہو، اس کے سامنے بیویوں کے بارے میں حضورؐ کی سنت، تاکیدی احکام، ہدایات اور وصایا ہوں، خود آپ کا اسوہ ہو، اسے اپنی اس بیوی سے محبت ہو، جو اپنے گھر سے اٹھ کر آئی ہے اور بالکل اسی کی ہو رہی ہے، اس کی خدمت کرتی ہے، (حالانکہ یہ اس پر شوہر کا حق نہیں)، اس کے بچوں کو اٹھائے اٹھائے پھرتی ہے، ان کی تربیت کرتی ہے ---- تو وہ کم سے کم ان چیزوں کا ازالہ ضرور کرے گا جو اس کی بیوی کے لیے تکلیف اور ایذا کا باعث ہوں۔ وہ اس کے لیے مضبوط موقف اختیار کرے گا۔ وہ اس کو پرائیویسی اور تخلیہ مہیا کرے گا۔ لیکن اگر شوہر کو آپ کی ان تکالیف کی فکر نہ ہو، یا وہ نرم چارہ (SPINELESS) ہو---، تو پھر، میرے تجربے کی حد تک، صرف

شریعت کے احکام کا کشف و اظہار آپ کے مسائل و مشکلات حل کرنے میں کچھ بھی مددگار نہ ثابت ہو سکے گا۔ اس لیے آپ کو اول اپنی توجہ اپنے شوہر پر مرکوز کرنا چاہیے۔ حق بھی اس پر بنتا ہے نہ کہ ساس سسر' یا دیور اور نند پر۔ علیحدہ گھر کا خرچ شوہر پر آتا ہے' اس کو دینا چاہیے۔ لیکن آپ اس سلسلے میں ازراہ حسن سلوک اور اپنی مدد آپ کی خاطر خرچ اٹھانے میں ہاتھ بٹائیے---' اگر بٹا سکتی ہیں--- تو اس میں کوئی ہرج نہیں۔ بلکہ اچھی بات ہے۔

اللہ آپ کا اور آپ کی طرح دوسری عورتوں اور لڑکیوں کا حامی و ناصر ہو۔ (خرم مراد)

مخلوط اجتماع

مخلوط اجتماع کے بارے میں میرے استفسار پر جن خیالات کا اظہار آپ نے فرمایا ہے' اسے بار بار پڑھنے پر بھی تسلی نہیں ہوئی۔ پہلی بات یہ ہے کہ میری تحریر میں چہرے کے پردے کا ذکر ہی نہیں جس کو آپ نے اختلافی مسئلہ کہہ کر اس کی اہمیت کو کم کر دیا ہے۔ میں نے یہ نہیں لکھا ہے کہ جو چہرہ نہیں ڈھانکتیں وہ کسی معصیت کا ارتکاب کرتی ہیں۔ میرا سوال تو صرف مخلوط اجتماعات کے بارے میں تھا۔

موجودہ دور میں جب کہ عورت اور مرد شانہ بشانہ کا نعرہ ایک مہم کے طور پر جاری ہے' عورت اور مرد ایک جگہ اکٹھے ہو چکے ہیں' لے دے کے صرف مذہبی اجتماع (غیر مخلوط) سکون قلب اور انسانیت کی رہنمائی کے لیے ایک ذریعہ تھا جس کو ہم اپنے ہاتھوں مٹا کر دفن کرنے پر تلے ہوئے ہیں--- اور--- نے پردے میں بیٹھی ہوئی خواتین کے لیے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ جو لوگ مخلوط اجتماع کے قائل نہیں 'کیا ان کو گھروں میں بیٹھ جانا چاہیے یا پھر کوئی دوسری تنظیم بنالینی چاہیے؟۔ اب لڑکوں اور لڑکیوں کی میٹنگ معمول بن چکی ہے۔ جو لڑکی ایسی میٹنگ میں شامل نہیں ہوتی اس کو تنظیم میں کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ اس طرح محرم اور نامحرم کی اصطلاح تو بے معنی ہو جاتی ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ؒ نے یہ اصول بیان کیا ہے کہ جب کسی نظریے کی یلغار ہو رہی ہو تو پوری قوت کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا جائے اور جو تھوڑی بہت گنجایش اس کے حق میں نکلتی ہو وہ بھی ختم کر دینی چاہیے نہ کہ ہم بھی اسی رو میں بہہ نکلیں۔ انھوں نے مسلمانوں کو عزیمت کی راہ دکھائی نہ کہ رخصت کی۔ دریافت طلب بات یہ ہے کہ مخلوط اجتماع کا اجتہاد کس زمانے میں ہوا اور کس نے کیا؟۔ رخصتیں نکالنا شروع کر دیں تو اس کے لیے کون سی حد باقی رہ جاتی ہے؟

آپ کی اس بات سے مجھے اتفاق ہے کہ ایک مسلک میں مختلف اور متضاد آرا والے لوگ جمع ہو سکتے ہیں اور انھیں جمع ہونا چاہیے۔ لیکن عملی طور پر اجتماعی طریقہ کار کے لیے صرف ایک ہی راستہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مغربی ممالک میں بھی کوئی ایک طریقہ ہی قابل عمل ہو سکتا ہے۔

تسلی اور اطمینان بخشنا تو اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ میرا کام تو اپنے علم و فہم تک صحیح بات بتا دینا ہے اگر آپ کسی رائے سے جذباتی طور پر وابستہ نہ ہوں، تو دوسری مختلف رائے سمجھ میں ضرور آسکتی ہے، خواہ اس سے اتفاق نہ ہو۔

چہرے کا پردہ اختلافی ہے، یہ معروف بات ہے۔ فقہ و تفسیر کی کسی کتاب کو اٹھا کر دیکھ لیجیے، یہی لکھا ملے گا۔ اسی لیے تو زمانہ قدیم سے آج تک اس مسئلے پر اکابر کے درمیان اتنی بحثیں ہیں، کسی فریق کی یہ خواہش کہ دوسرے سب اسی کی رائے کو عین حق سمجھ لیں اور اپنی رائے سے دست بردار ہو جائیں، کسی طرح پوری نہیں ہوتی۔ بلکہ اختلاف کی شدت بڑھتی جاتی ہے۔

"یہ کہنے کا مقصد اہمیت کم کرنا تھا" یہ آپ کی تعبیر ہے۔ اختلافی رائے کو نص کا مقام دینا بھی غلو اور انحراف کا سبب ہے۔ اس لیے غلو اور تشدد سے بچانے کے لیے اور دین میں مطلوب رواداری پیدا کرنے کے لیے اس کا اظہار ضروری تھا۔ اس بات کو چھپانا گناہ ہوتا۔ مسائل کی اصل حیثیت سے ناواقفیت یا ان کو نظر انداز کرنے ہی سے تفرقہ اور فساد بڑھتا ہے۔ سید مودودیؒ نے اس پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔

چہرے کے پردے اور مشترک اجتماع کا باہمی گہرا تعلق ہے۔ اس لیے میں نے اس مسئلے کا ذکر ضروری سمجھا۔ جن لوگوں کے نزدیک چہرے کے پردے کا حکم نہیں، ان کے نزدیک مشترک اجتماع میں کیا قباحت ہو سکتی ہے۔ اگر آپ کی رائے میں جو چہرہ کھلا رکھتی ہیں، وہ کسی نافرمانی کی مرتکب نہیں ہوتیں، تو پھر مشترک طور پر معاملات انجام دینے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ چہرے پر نقاب کے ساتھ بھی خواتین کاروبار کرتی ہیں، شاپنگ کرتی ہیں، مشترک کلاسوں میں جاتی ہیں۔

مشکل یہ ہے کہ آپ بار بار مخلوط اجتماع کا لفظ استعمال کر رہے ہیں۔ اس سے ایک غلط نقشہ سامنے آتا ہے۔ یعنی ایسا اجتماع جہاں مردوں عورتوں کا آزادانہ اختلاط ہو۔ اس کے جواز کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے میں نے مشترک اجتماع کی اصطلاح وضع کی ہے، اور استعمال کر رہا ہوں۔ اس کی مثال عہد نبویؐ میں مسجد نبویؐ کا مذہبی اجتماع تھا۔ عورتیں پیچھے بیٹھتی تھیں، مرد آگے۔ ان کا راستہ الگ تھا، ان کا الگ۔ عید کی نماز میں بھی نبیؐ نے بڑی تاکید سے عورتوں کو بلایا۔ جوان عورتوں کو بھی۔ یہ بھی اسی طرح کا مشترک اجتماع تھا۔ دور اول سے آج تک ایسے اجتماعات ہوتے رہے ہیں۔ اب ہمارے دیار ہند و پاکستان میں نہ ہوتے ہوں، آج آپ دیار عرب میں مقیم ہیں وہاں آپ ہی کی طرح خدا اور رسولؐ کے باوفا اور جاں نثار بندے اسی قسم کے اجتماعات کر رہے ہیں۔ ہمارے دیار میں بھی یونی ورسٹیوں، کالجوں، ہوائی اڈوں، بازاروں، اور بسوں میں اس نوعیت کے مشترک اجتماعات ہوتے ہیں۔ ان میں چہرے کا حجاب کرنے والیاں بھی شامل ہوتی ہیں۔ ہاں اختلاط نہیں ہوتا۔ مخلوط کے لفظ

سے خلط مبحث ہوتا ہے۔

اس لیے پہلے دونوں کے صحیح ہونے کے امکانات کو تسلیم کیجیے۔ پھر غور کیجیے کہ آپ جس ماحول اور مقام پر ہیں ' آپ کی اپنی عورتیں اور بچیاں جس طرح عام زندگی گزار رہی ہیں ' جہاں آپ کو دنیا بھر کے تحریکی ساتھیوں کے ساتھ مل کر دین کا کام کرنا ہے ' جہاں آپ کو غیر مسلموں میں بھی دعوتی کام کرنا ہے ' ان کے اجتماعات میں بھی جانا ہے اور انھیں بھی اجتماعات میں بلانا ہے ' وہاں کون سا طریقہ زیادہ حکیمانہ ہے۔ اپنی تنظیم میں آپ بے شک ایک ہی طرز کے اجتماع کی پابندی کریں ---- دونوں میں سے کسی کی بھی کر سکتے ہیں ---- لیکن جب دوسری تحریکوں کے ساتھ مل کر کام کریں گے ' تو کچھ کسر و انکسار تو ہوگا۔ ہر ملک اور مقام پر وہاں کے رواج اور چلن اور وہاں پر حکمت دعوت و دین کے لحاظ سے فیصلہ ہوگا۔ (خ - م)

کتاب نما

Iqbal's Reconstruction of Ijtihad ‘ڈاکٹر محمد خالد مسعود۔ ناشر: اقبال اکادمی پاکستان‘ لاہور۔ صفحات: ۲۲۶۔ قیمت: ۱۲۵ روپے۔

یہ کتاب مصنف کے تقریباً پندرہ برسوں کے مطالعے‘ غور و فکر اور تحقیق کا ماحصل ہے۔ انھوں نے ۱۹۷۷ میں ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے ایک منصوبے کے تحت اقبال کے تصور اجتہاد پر تحقیق کا آغاز کیا تھا۔ جلد ہی انھیں فل برائٹ وظیفے پر امریکہ کے بعض کتب خانوں سے استفادے کا موقع ملا‘ جس کے نتیجے میں انھوں نے اس موضوع پر چند مقالات تیار اور شائع کرائے اور کولمبیا یونی ورسٹی میں منعقدہ ایک بین الاقوامی اقبال سیمینار میں بھی ایک مقالہ پیش کیا۔ ۱۹۸۰ میں اس موضوع پر ایک کتاب تیار کی جو ”اقبال کا تصور اجتہاد“ کے عنوان سے ۱۹۸۵ میں راولپنڈی سے شائع ہوئی۔ اس کے بعد بھی یہ موضوع برابر ان کے زیر مطالعہ رہا۔ اب انھوں نے اپنے نتائج تحقیق کو متعدد اضافوں کے ساتھ زیر نظر انگریزی کتاب میں مرتب کیا ہے۔

آٹھ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں مصنف نے اجتہاد کے مختلف مفاہیم‘ اس کے تاریخی پس منظر اور ارتقا اور مسائل اجتہاد پر سیر حاصل بحث کے بعد خطبات اقبال کے چوتھے خطبے The Principle of Movement in the Structure of Islam (اسلام میں اصول حرکت یا اجتہاد فی الاسلام) پر تفصیل سے معلومات فراہم کی ہیں۔ جس میں زیر بحث مقالے کی تیاری اور تحریر و ترتیب کی پوری تفصیلات بیان کی ہیں۔ بعد ازاں بتایا ہے کہ اقبال کے ہاں اجتہاد کا کیا مفہوم ہے‘ وہ اس کی کیا تعریف کرتے ہیں‘ اور قرآن‘ حدیث‘ اجماع اور قیاس کو مصادر اجتہاد کی حیثیت سے وہ کیا مقام دیتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد خالد مسعود کے خیال میں علامہ نے کئی برسوں کے غور و فکر اور تفکر و تدبر کے بعد یہ خطبہ پیش کیا‘ چنانچہ مسلم اہل فکر و دانش پر اس کے مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ اقبال اجتہاد کو جامد مسلم معاشرے میں ایک حرکی اصول کے طور پر لیتے ہیں۔ مصنف کے نزدیک یہ بات اس لیے اہم ہے کہ اقبال نے اجتہاد کی اہمیت پر اس زمانے میں زور دیا جب قدامت پرست حلقے اجتہاد کو ممنوع یا ناممکن قرار دیتے تھے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اوائل میں علامہ اقبال بھی زمانہ انحطاط میں تقلید کو کوئی اجتہاد سے بہتر سمجھتے تھے۔"رموز بے خودی" (۱۹۱۸) میں کہتے ہیں:

اجتہاد اندر زمان انحطاط قوم را برہم ہمی پیچد بساط
ز اجتہاد عالمان کم نظر اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

(انحطاط کے زمانے میں اجتہاد، قوم کا شیرازہ بکھیر کر اس کی بساط لپیٹ دیتا ہے۔کوتاہ نظر عالموں کے اجتہاد سے اسلاف کی پیروی زیادہ محفوظ ہے)۔لیکن ابھی ایک عشرہ بھی نہیں گزرا تھا کہ انھوں نے عصری تقاضوں کا ادراک کرتے ہوئے، اپنا نقطہ نظر تبدیل کر لیا اور وہ اجتہاد کو مسلم معاشروں کی حیات نو کے لیے ضروری قرار دینے لگے۔

زیر نظر کتاب کے مصنف کہتے ہیں کہ مسئلہ اجتہاد کے سلسلے میں اقبال کو اس کی عملی مشکلات کا بخوبی احساس تھا، چنانچہ انھوں نے مجتہد کی اہلیت پر بھی بحث کی ہے۔ان کے خیال میں علما جدید علوم اور سائنس سے ناواقف ہیں اس لیے وہ اس بات کے قائل نظر آتے ہیں کہ عصر حاضر میں فرد واحد کے لیے معمولی سا اجتہاد کرنا بھی ممکن نہیں۔اسی لیے انھوں نے اجتہاد کی ذمہ داری افراد سے اداروں کی طرف منتقل کرنے کی تجویز پیش کی۔وہ کہتے ہیں کہ دور جدید میں منتخب نمایندوں پر مشتمل قانون ساز اسمبلی کو اجتہاد کی عظیم ذمہ داری کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ اقبال کی دوسری تجویز یہ ہے کہ اجتہاد اور اجماع کو باہم مربوط کر دیا جائے۔ مصنف کہتے ہیں کہ نفاذ اسلام کے سلسلے میں بھی اجتہاد کا مسئلہ زیر بحث رہا ہے۔خصوصاً یہ امر کہ اجتہاد میں علما کی حیثیت کیا ہوگی؟ اس کا حتمی فیصلہ آسان نہیں۔ایک رائے یہ ہے کہ پارلیمنٹ کے ممبر تو عوام کے نمایندے ہیں اور علما، اللہ اور رسولؐ کی نمایندگی کرتے ہیں۔مگر اس نقطہ نظر کو تسلیم کر لیا جائے تو کیا آگے چل کر اس سے دین و دنیا کی تفریق کے رجحان کو تقویت نہ ملے گی؟ علامہ اقبال مسلم فکر کے اہم نمایندے ہیں۔بلاشبہ وہ ایک بڑے شاعر، بڑے مفکر اور بڑے انسان تھے۔بایں ہمہ انھوں نے اپنی رائے کی کامل صحت پر کبھی اصرار نہیں کیا تھا۔انھوں نے اجتہاد کے مسئلے پر بھی جو کچھ لکھا اسے اپنی تجاویز کے طور پر پیش کیا۔ ڈاکٹر خالد مسعود کہتے ہیں کہ پاکستان اقبال کے خوابوں کی تعبیر ہونے کا دعوے دار ہے۔چنانچہ اس ملک پر اقبال کا حق بنتا ہے کہ اس کے افکار پر سنجیدگی سے غور کیا جائے، ان پر علمی گفتگو ہو اور پھر حسب ضرورت انھیں بہتر شکل و صورت میں قبول کیا جائے۔

اقبال کے تصور اجتہاد کے سلسلے میں حالیہ برسوں میں اسمبلیوں کو اجتہاد کی ذمہ داری سونپنے کی بات بہت اچھالی گئی ہے، اس ضمن میں ایک بات تو یہ ہے کہ اول تو اقبال، اسمبلیوں کو اجتہاد کی کلی ذمہ داری نہیں سونپتے بلکہ وہ علما کی مشاورت اور شمولیت کو ضروری قرار دیتے ہیں۔دوسرے اسمبلیوں کی

جو موجودہ صورت حال ہے اور ارکان کا جو ذہنی اور تعلیمی اور اخلاقی معیار ہے' اقبال نے اس سطح کا کبھی تصور بھی نہ کیا ہوگا۔

ڈاکٹر خالد مسعود نے زیر بحث موضوع پر بڑی محنت اور دقت نظر سے تحقیق کی ہے۔ انھوں نے اقبال پر بعض مصری علما (سید قطب' محمد البہی) اور بعض مستشرقین کی تنقید پر بھی بحث کی ہے۔ انھوں نے جملہ بنیادی اور ثانوی ماخذ سے استفادہ کرتے ہوئے بحث کو آگے بڑھایا ہے۔ ان کا انداز و اسلوب عالمانہ اور متوازن ہے۔ گذشتہ چند برسوں سے اقبالیات میں خطبات اقبال کے مطالعے کا رجحان روز افزوں ہے۔ زیر نظر کتاب اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اقبال کے تصورات اجتہاد کے سلسلے میں اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے زیر نظر کتاب ان سب میں مفصل' جامع اور اہم ہے۔ خوش آیند امر یہ بھی ہے کہ کتاب کی ترتیب و تدوین میں مصنف نے جدید ترین تحقیقی تقاضوں کا خیال رکھا ہے اور ناشر نے اسے نہایت اچھے معیار پر شائع کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب افکار اقبال پر مباحث میں ایک عمدہ اضافہ ہے۔ (رفیع الدین ہاشمی)

دارا شکوہ احوال و افکار' محمد سلیم۔ ناشر: مکتبہ کارواں' کچہری روڈ' لاہور۔ صفحات: ۱۷۲۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔

دارا شکوہ تاریخ ہند اور مغل دور حکومت کا ایک اہم مگر متنازع کردار ہے۔ میں اپنے اس لائق فائق بیٹے کو تخت طاؤس پر متمکن دیکھنا چاہتا تھا مگر نیرنگی زمانہ دیکھیے کہ شاہ جہاں کی تمام تر خواہشات اور کوششوں کے باوجود دارا شکوہ ناکام رہا اور فرماں روائی اورنگ زیب عالمگیر کے حصے میں آئی۔ شہزادہ دارا شکوہ ۴۶ سال کی عمر میں قتل کر دیا گیا۔ زیر نظر کتاب میں مقتول شاہزادے کے حالات زندگی' اس کے علمی کام' سیاسی حکمت عملی اور مذہبی افکار کا بڑی خوبی' عمدگی اور مہارت کے ساتھ اور آسان زبان میں تعارف اور تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

مصنف دارا شکوہ کے افکار پر اپنا تبصرہ بھی پیش کرتے ہیں اور اس حوالے سے دارا شکوہ کی خوبیاں اور خامیاں بھی نمایاں ہوتی چلی جاتی ہیں۔ آخری باب بعنوان "شخصیت اور مذہب" ایک اعتبار سے زیر نظر مطالعے کا حاصل ہے۔ دارا شکوہ کی شخصیت "مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی" کا مصداق نظر آتی ہے۔ مصنف بتاتے ہیں کہ وہ بہت سی خوبیوں کا مالک تھا۔ عالم' فاضل' صاحب ذوق' ذہین' نکتہ سنج' شیریں بیاں' حاضر جواب' فیاض' لیکن طبیعت کے بعض تضادات کی وجہ سے یہ خوبیاں اس کے کام نہ آسکیں' مثلاً وہ ان لوگوں کے لیے تحقیر کا اظہار کرتا تھا جو کسی معاملے میں اسے مشورہ دینے کی جرات کرتے۔ شاہزادگی نے اس کے اندر ایک گونہ کج خلقی پیدا کر دی تھی۔ وہ امرا کو دھمکیاں دیتا اور ان کے لیے نازیبا الفاظ استعمال کرتا۔ لوگوں سے غرور اور تکبر سے پیش آتا۔ چونکہ

شاہ جہاں کا سب سے لاڈلا تھا اس لیے اس کے اندر خود سری اور خوشامد پسندی راسخ ہوگئی تھی۔ اختلاف رائے اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اس چیز نے اعیان سلطنت کو اس سے دور اور بد اعتماد کر دیا۔ شاہ جہاں کی نصیحتوں کے باوجود اس نے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ مصنف نے اس کی شخصیت کے ایک دلچسپ تضاد کی طرف اشارہ کیا ہے کہ "ایک طرف تو دارا شکوہ صوفی ہونے کا دعوے دار ہے اور دنیا سے لاتعلقی کا اظہار کرتا ہے مگر دوسری طرف وہ ہندستان کی حکومت کا تخت و تاج اپنے سر پر رکھنے کے لیے پوری کوشش کر رہا ہے۔ ہمیں صوفیاے کرام کی پوری تاریخ میں ایک شخصیت بھی ایسی نہیں ملتی جس نے اقتدار حاصل کرنے کے لیے جنگ یا جدوجہد کی ہو۔" (ص ۱۶۳)

دارا شکوہ کی ناکامی کا ایک سبب اس کے مذہبی افکار بھی تھے۔ اس کے علم و فضل' وسعت مطالعہ' دقت نظر اور شعر و ادب اور فنون لطیفہ سے اس کے فطری لگاؤ میں کلام نہیں۔ لیکن ایک تو خود ستائی' نام نہاد لبرل ازم اور بے باک خیالات اور دوسرے اپنے مرشد ملا شاہ سے اندھی عقیدت اسے گمراہی کے اس کوچے میں لے گئی کہ اس کی ذہانت و فطانت اور نہ شخصی خوبیاں اس کے کام آسکیں۔ اور مصنف کے بقول شاہ جہاں کے مسلمان امرا بھی دارا شکوہ کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ وہ شاہ جہاں کے بعد بادشاہ بنے کیونکہ وہ ہندو مذہب سے اتنا متاثر ہو چکا تھا کہ اس نے نماز' روزہ اور شریعت کی طرف سے عائد کردہ دیگر ضروری فرائض ترک کر دیے تھے۔ اس کے افکار و اعمال سے یہ واضح ہو چکا تھا کہ اس کے تخت نشین ہونے پر اسلام کی نئی نئی تاویلیں ہوں گی۔ مسلمانوں کے اعتقادات پر زد لگائی جائے گی اور اکبر بادشاہ کا دور لوٹ آئے گا۔ (ص ۱۶۳)

حکیم الامت علامہ اقبال نے کیسی پتے کی بات کہی تھی۔

تخم الحادے کہ اکبر پرورید باز اندر فطرت دارا دمید

(اکبر نے الحاد کا جو بیج بویا تھا اور اس کی نشو و نما کی تھی وہ دوبارہ دارا شکوہ کی فطرت میں پھلنے پھولنے لگا۔)

ڈاکٹر محمد سلیم ایک ممتاز ماہر طبیعیات ہیں اور اس حوالے سے پنجاب یونی ورسٹی کے مختلف شعبوں سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ ایک مختلف علمی موضوع پر ان کی یہ کاوش بہت عمدہ' دلچسپ اور قابل تحسین ہے۔ کتاب سائنٹی فک انداز میں لکھی اور تیار کی گئی ہے۔ حوالوں اور حواشی' اشاریے اور بنیادی ماخذ کا پورا اہتمام موجود ہے۔ کتاب میں دارا شکوہ کی تصانیف و خطوط کی فارسی عبارتوں کا اردو ترجمہ بھی دیا جاتا تو بہتر تھا۔ طباعت اور پیش کش کا انداز بھی معیاری ہے۔ امید ہے علمی حلقوں اور عام قارئین میں بھی گرم جوشی سے اس کتاب کا خیر مقدم ہو گا۔ (ر-ہ)

جماعت اسلامی کا تنہا مسافر' مولانا راحت گل۔ ناشر: مرکز علوم اسلامیہ پاکستان' راحت آباد' پشاور۔ صفحات: ۴۴۳۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔

مولانا راحت گل نے اس کتاب میں جماعت اسلامی کے حوالے سے اپنی تمام یادداشتیں سند کے ساتھ تاریخ کے حوالے کر دی ہیں۔ جماعت کا رکن نہ ہونے کے باوجود' انھوں نے علمائے سرحد میں جماعت کے لیے نرم گوشہ پیدا کرنے کے لیے ان تھک کام کیا۔ انھیں جماعت سے کچھ اختلاف بھی رہا لیکن انھوں نے یہ بڑی خوش گوار روایت قائم کی ہے کہ اس ضمن میں مولانا مودودی'' میاں طفیل محمد اور قاضی حسین احمد کے نام اپنے اور ان کے جوابی خطوط سب شائع کر دیے ہیں۔ اگر سب تنہا بلکہ غیر تنہا مسافر اسی طرح اپنی اپنی روداد یں مرتب کر دیں تو قافلے کی تصویر واضح ہو جائے گی۔ (کتنے ہی لوگ اپنے سینوں میں یادوں کا اور خطوط کا ایک قیمتی سرمایہ لیے بیٹھے ہیں جس میں تاریخ کے کتنے ہی موڑ محفوظ ہیں۔) اس نوعیت کی کتاب (یہ دوسرا ایڈیشن ہے!) اگر کامیاب ہو سکتی ہے تو اسے دوسروں کے لیے حوصلہ افزائی کا باعث ہونا چاہیے۔

جماعت اسلامی اور علما کا اس کے ساتھ یا اس کا علما کے ساتھ رویہ تحقیق کا ایک بہت اچھا موضوع ہے کہ کوئی محقق اس پر غیر جانبداری سے کام کرے۔ قیام جماعت کے اولین روز سے آج تک اس میں اتار چڑھاؤ رہے ہیں اور دونوں طرف سے بہت کچھ لوازمہ موجود ہے۔ ابھی تو انٹرویو بھی لیے جا سکتے ہیں۔ اس حوالے سے یہ کتاب قیمتی معلومات فراہم کرتی ہے۔

مولانا راحت گل رابطہ مدارس عربیہ کے پہلے کنوینر تھے۔ چنانچہ رابطہ کے پہلے سات سال کی رپورٹ شامل کتاب ہے جس میں دس روپے چندہ دینے والوں کے نام بھی ہیں۔ لیکن ''تنہا مسافر'' کی یہ شکایت قابل توجہ ہے کہ اب رابطہ کی تاریخ میں ان کا ذکر ہی نہیں ہوتا۔

یوں تو یہ کتاب واقعات سے بھری پڑی ہے لیکن ۲۳ اگست ۱۹۴۷ کو جامعہ کراچی میں مولانا مودودی'' کے خطاب اور عبدالمالک مجاہد سے شفیع نقی جامعی کو صدارت کی منتقلی کی تقریب کا بیان بڑا ایمان افروز ہے۔ والی سوات اور جماعت اسلامی کے درمیان غلط فہمیاں دور کرنے کے لیے ان کی کوشش' سالانہ اجتماع ۶۳ میں فائرنگ کے بعد بھی اس سلسلے میں مولانا مودودی'' سے ان کی گفتگو لیکن پھر والی سوات کا بعض علما کی وجہ سے مولانا مودودیؒ سے برگشتہ ہی رہنا' اور ایسے کتنے واقعات اسے بڑی دلچسپ اور معلومات افزا کتاب بنا دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ مولانا راحت گل نے جماعت اسلامی کے لیے جو کچھ کیا' اس کا حال' جو خطوط لکھے' جو جواب ملے' جو رسالے میں اداریے لکھے' غرض ہر چیز ملے گی۔ (مسلم سجاد)

اردو' قومی یک جہتی اور پاکستان' ڈاکٹر فرمان فتح پوری۔ ناشر: انجمن ترقی اردو پاکستان

کراچی - صفحات : ۱۶۷ - قیمت: ۶۰ روپے -

پاکستان میں ایک زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ مقبول عام (اور اسی لیے اہم) زبان اردو ہے - اردو کی نشوونما میں اگرچہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترکہ کوششیں شامل رہیں لیکن تاریخ کے ایک خاص موڑ پر ہندو اکثریت نے اس زبان کو محض اس لیے نشانہ بنایا کہ اس کا رسم الخط فارسی ہے اور اس کی ثقافتی اور لسانی فضا پر مسلم نقوش حاوی ہیں - وقت کے ساتھ ساتھ اردو سے ہندوؤں کا عناد بڑھتا گیا اور یہ خدشہ پیدا ہو گیا کہ کسی وقت آگے چل کر ہندو' مسلمانوں پر ہندی کو جبراً ٹھونسنے کی کوشش کریں گے - یہی وجہ ہے کہ اردو کا مسئلہ مسلم لیگ کے مطالبات میں شامل کیا گیا اور جب پاکستان بنا تو اس کو پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان قرار دے دیا گیا - قیام پاکستان کے بعد تنگ نظر عناصر اور انگریزی نواز موثر اقلیت نے اردو کی اس حیثیت کو متنازع بنانے کی کوششیں شروع کر دیں - پہلے بنگالی کو اس کا مدمقابل قرار دیا گیا اور پھر پاکستان کی دوسری زبانوں کو - نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزی کو پاکستان کے در و بام پر مسلط رہنے کا سنہری موقع میسر آگیا - اس صورت حال نے پاکستان کی آزادی اور استحکام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا - اردو کی اہمیت کو نظر انداز کرنے کا سب سے زیادہ نقصان قومی وحدت اور یک جہتی کو پہنچا - علاوہ ازیں اس سے نہ صرف تعلیمی ترقی متاثر ہوئی بلکہ حکومت اور عوام کے درمیان بے اعتمادی اور نفرت کی وہ دیوار بھی حائل ہوئی جس نے اجتماعی ترقی کو مشکوک بنا دیا - لہٰذا اہل علم نے ہمیشہ یہ مطالبہ کیا کہ انگریزی کی بالادستی ختم کی جائے - اردو کو قومی اور سرکاری حیثیت سے ترقی دی جائے اور دوسری زبانوں کو ان کا جائز حق دینے میں بخل سے کام نہ لیا جائے -

کون نہیں جانتا کہ اردو برعظیم ہی نہیں عالمی سطح پر بھی اہم مقام رکھتی ہے خصوصاً پاکستان کے مختلف علاقوں کے لوگوں کے باہمی رابطے کے لیے اس کی اہمیت روز روشن کی طرح عیاں ہے - اس میں سرکاری اور دفتری زبان بننے کی پوری صلاحیت ہے - جو لوگ اس کی صلاحیت اور استعداد کا انکار کرتے ہیں وہ محض تعصب و تنگ نظری کی بنا پر ایسا کرتے ہیں - مختلف اہل علم نے ان لوگوں کے اعتراضات کے نہایت مدلل جوابات فراہم کیے ہیں - زیر نظر کتاب میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے نہایت عمدہ انداز میں اردو کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ اردو کے نفاذ اور ترویج کی بدولت ہم قومی وحدت و یک جہتی حاصل کر سکتے ہیں اور پاکستان کو حقیقی معنوں میں پاکستان بنا سکتے ہیں -

کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے جن کے عنوانات بالترتیب یوں ہیں: قومی یک جہتی کا پس منظر و محرکات' مسلمانوں میں یک جہتی کی تحریک کا آغاز' مسلم قومی یک جہتی کا ایک طاقتور محرک اردو' مسلم

قومی یک جہتی اور تحریک پاکستان، مسلم قومی یک جہتی اور تحریک پاکستان کے آخری دس سال۔ آخر میں پیرحسام الدین راشدی اور علامہ آئی آئی قاضی کے مقالے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ اردو کی عظمت کو ہر انصاف پسند عالم اور محقق نے خراج تحسین پیش کیا ہے خواہ اس کا تعلق کسی بھی خطے سے ہو۔ کتاب کا مقدمہ جمیل الدین عالی کے قلم سے ہے اور خاصے کام کی چیز ہے۔ کتاب کی ترتیب اور طرز استدلال موثر ہے اور اس امر کی ضرورت ہے کہ کتاب کو زیادہ پھیلایا جائے تاکہ اردو کے بارے میں غلط فہمیوں کو دور کر کے قومی یک جہتی کی راہ ہموار کی جاسکے۔ (رحیم بخش شاہین)

عورت، اپنی جنت میں، سید نظر زیدی۔ ناشر: مکتبہ ادب پبلشرز، اردو بازار، لاہور۔ صفحات: ۱۲۲۔ قیمت: ۱۲۰ روپے۔

سید نظر زیدی ہمارے بزرگ اہل قلم میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ تقریباً نصف صدی سے موصوف کا قلم تاریخ، سیرت، ناول، افسانہ، تنقید، شاعری اور بچوں کے لیے نثر نگاری میں رواں ہے۔ "عورت اپنی جنت میں" ان کی تازہ کتاب ہے۔

ہمارے ملی اور معاشرتی زوال و انحطاط میں ایک بہت بڑا دخل اس بات کا بھی ہے کہ ہم نے طبقہ نسواں کے بارے اللہ اور رسول اللہؐ کی ہدایات کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ "نصف بہتر" کے مسئلے پر خدائی ہدایات سے روگردانی صریح کفر کے برابر ہے اور کفر کا انجام ہلاکت اور تباہی و بربادی ہے۔

جناب نظر زیدی نے اس مسئلے کا مکمل فکری و نظری، تاریخی اور معاشرتی جائزہ لیا ہے اور بڑے اعتدال اور راست فکری کے ساتھ عورت کے حقیقی مقام و مرتبے، خواتین کے دائرہ کار، مساوات مرد و زن اور دیگر متعلقہ پہلوؤں پر اظہار خیال کیا ہے اور اس مسئلے کے حل کے لیے ہمارے بعض اکابر نے جو کوششیں کیں ان کا ذکر بھی کیا ہے۔ زمانہ حال کی "اصلاح نسواں" کی تحریکوں نے "ترقی" کے لیے عورت کی فطری شرم و حیا کو ختم کرنے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔ بقول مولانا مودودیؒ "ترقی کا کوئی کام ان اہل مغرب، شیاطین اور ان کے شاگردوں کے ہاں شروع نہیں ہو سکتا جب تک عورت کو بے پردہ کر کے وہ بازار میں نہ لاکھڑا کریں اور اسے کسی نہ کسی طرح عریاں نہ کر دیں۔" ان کے لیے یہ بات ناقابل برداشت ہے کہ طالبات سر کو سکارف سے ڈھانپیں۔ مغرب کی اس آزاد خیالی پر کسی نے بڑا اچھا تبصرہ کیا ہے: free to bare but not cover (ننگا ہونے کی تو آزادی ہے مگر پردے کی پابندی ہے۔) انجام کار یہ راستہ تباہی و بربادی کا ہے۔ اس حوالے سے زیدی صاحب نے بالکل صحیح کہا کہ "مغرب کے زیر اثر طبقہ نسواں کی بھلائی کی تحریک کو ایسا رخ دیا جارہا ہے جو خود اس طبقے کے مصائب میں بھی اضافہ کرے گی اور معاشرے کی مصیبتیں بھی زیادہ ہوں گی۔" کتاب کے پہلے ہی باب کا عنوان بہت معنی خیز ہے۔ "عورت مرد کی رفیق یا فریق؟" یعنی

اسلام نے تو عورت کو رفاقت کا درجہ دیا، مگر مغرب نے اسے فریق کا درجہ دے کر، مرد کا رقیب بنا دیا اور یوں ایک فتنے، مناقشے اور عداوت کا آغاز ہوا۔

نظر زیدی نے اپنے ماہرانہ تجزیے میں بڑا دھیما مگر موثر لہجہ اختیار کیا ہے۔ ان کی نظر مسئلے کے جملہ پہلوؤں تک گئی ہے اور مسئلہ زیر بحث واضح ہو کر اور نکھر کر سامنے آگیا ہے۔ تباہی اور بربادی کے جس راستے پر ہم چل رہے ہیں اس سے بچنے کی "اگر کوئی صورت باقی ہے تو صرف یہ کہ نسل انسانی مکانوں اور جسموں کو سجانے کی بجائے دلوں اور روحوں کو سجانے پر زیادہ توجہ دے۔ یہ جو زیادہ سے زیادہ روپیہ حاصل کرنے اور پھر اسے دوسروں کو تباہ کرنے کی دوڑ شروع ہوگئی ہے، اسے ختم ہونا چاہیے۔ اور اس مبارک کام کا آغاز ذی شعور خواتین بہتر طور پر کر سکتی ہیں"۔ کتاب عمدہ چھپی ہے۔ (ر - ہ)

تاریخ خاندیش کے بکھرے اوراق، ڈاکٹر اکبر رحمانی۔ ناشر: ایجوکیشنل اکادمی اسلام پورہ، جلگاؤں، بھارت۔ صفحات: ۱۳۴۔ قیمت: ۵۰ روپے۔

خاندیش، مغربی بھارت کا ایک خطہ ہے جو ۱۹۶۱ کے بعد سے ضلع جلگاؤں اور ضلع دھولیہ میں تقسیم ہے۔ ڈاکٹر رحمانی نے اس خطے کی تاریخ سے متعلق، اپنے چند تحقیقی مضامین یکجا کیے ہیں۔ خاندیش میں مسلمانوں کا تناسب آبادی دس فیصد سے بھی کم تھا مگر پورے علاقے میں مدرسے اور دارالعلوم قائم تھے۔ ان میں برہان پور کا عظیم الشان مدرسہ خاصی شہرت رکھتا تھا۔ (اورنگ زیب کی داستان معاشقہ کے بارے میں چار مضامین ہمارے خیال میں کتاب کے موضوع سے غیر متعلق ہیں)۔ قارئین خصوصاً تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے زیر نظر کتاب کو معلومات افزا اور مفید پائیں گے۔ (ر - ہ)

صبر، قرآن و حدیث کی روشنی میں، ڈاکٹر محمد ابراہیم عبدالسلام۔ ملنے کا پتا: ادارہ الحسنات منصورہ لاہور، ادارہ منشورات اسلامی بالمقابل منصورہ لاہور۔ صفحات: ۸۴۔ قیمت: ۲۰ روپے۔

صبر، قرآنی اور نبویؐ نیز انسانی اخلاق و اوصاف میں سے ایک نہایت ہی اہم وصف ہے۔ ڈاکٹر محمد ابراہیم عبدالسلام (استاذ سید مودودی بین الاقوامی تعلیمی انسٹی ٹیوٹ لاہور) نے بقول مولانا عبدالمالک: "صبر کے موضوع پر آیات قرآنیہ، احادیث نبویہ، اقوال صحابہ و تابعین اور سلف و صالحین کے زریں اقوال کی روشنی میں سیر حاصل بحث ہے۔" اپنے موضوع پر ایک قابل مطالعہ کتاب ہے۔ (ر - ہ)

مدیر کے نام

راشد الیاس مہر، لاہور

"ایک رائے کے مطابق مسلمانوں کی مستقبل کی زبان انگریزی ہے" (اکتوبر ۹۶ ص ۸۲) ترجمان میں پڑھ کر عجیب لگا۔ انگریزی تو یونانی اور لاطینی کی طرح ام الالسان بھی نہیں۔ مغرب کی تہذیب اب روبہ زوال ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی زبان بھی تاریخ کا حصہ بن جائے گی۔ مستقبل مسلمانوں کا ہے۔ عروج کے ساتھ ان کی زبان عربی کا دور آئے گا۔ ایک رائے رکھنے والے احساس کمتری کا شکار معلوم ہوتے ہیں۔

محمد جعفر، پنڈی

رسول اللہؐ کی وفات پر حضرت ابوبکرؓ نے جو کہا (اکتوبر ۹۶ ص ۷۳) اس کے درست الفاظ یہ ہیں:
من کان یعبد محمد افان محمد اقدمات ومن کان یعبد اللہ فان اللہ حی لایموت۔

فصیح احمد، حیدر آباد

اختلاف امت۔ اسباب اور حل (اکتوبر ۹۶) میں علمائے کرام کے لیے واضح اور صاف لائحہ عمل پیش کر دیا گیا ہے۔ کیا کوئی ایسی سبیل نہیں ہو سکتی کہ ہر مسجد کا امام اس کا مطالعہ کرے اور اپنی سرگرمیوں میں ان امور کا لحاظ رکھ کر اتحاد امت میں اپنا کردار ادا کرے۔

انوار الحق، سرگودھا

ایسے مضامین شائع کرنے کا کیا فائدہ جس سے دوسرے علما کی دل آزاری ہو (استیصال بدعات کا جوش، اکتوبر ۹۶)۔ حکمت اور مصلحت بھی کوئی چیز ہے---- اگر کسی صحابی نے کسی فوت شدہ بزرگ سے توسل کیا ہے تو اس کا حوالہ پیش فرمائیں۔ مباحات کا دائرہ تنگ نہ کرنے کی خاطر کیا کیا جائز کریں گے۔ یہ قل، چالیسویں، برسیاں، سالگرہیں، سجدہ تعظیمی کیا سب مباحات میں آجاتے ہیں۔ پھر بنوامیہ پر کیا اعتراض کہ انھوں نے عیدین کی اذان بھی جاری کی۔ پھر تو نماز جنازہ کے لیے اذان بھی مباحات میں ہوگی۔ امام ابن تیمیہ نے صاف لکھا ہے کہ جس چیز کو حضورؐ نے ترک کیا اس کا ترک کرنا سنت ہے۔ آپ مباحات کا دائرہ وسیع کرنے پر زور دے رہے ہیں۔ اگر یہی حالت رہی تو خدا جانے دائرہ کہاں جاکر ختم ہو۔

سید احمد علی شاہ، حضرو

متوفی بزرگان دین کے اعمال صالح کو کس طرح وسیلہ دعا بنایا جاسکتا ہے۔ بزرگان دین ہوں یا کوئی عام متوفی، زندہ وارثوں یا لوگوں کی طرف سے صدقہ، دعا، قربانی اور حج بدل تو ان کے حق میں نافع ہو سکتا ہے لیکن اس طرح ان سے توسل کی صورت کیسے نکل سکتی ہے؟ ہم اس بارے میں بے خبر ہیں کہ کس کے ساتھ کیا

معاملہ کیا جارہا ہے۔ ان کے اعمال کے صالح ہونے کا علم صرف خدا کے پاس ہے۔ ان کو ان کے اعمال صالح کے ذریعے وسیلہ بنانا ہمارے لیے نافع نہیں ہو سکتا۔

محمد یاسین، کراچی

استیصال بدعات کا جوش (اکتوبر ۹۶) میں سید مودودیؒ نے بڑی اہم حکمت بیان کی ہے۔ آج کے دور میں جب امت عرصہ محشر میں ہے، قوم موت و زیست کے مسئلے کا شکار ہے، اچھے بھلے مخلص مسلمان جزئیات ہی کو اصل دین سمجھ کر اپنی ساری توانائیاں اور ہر طرح کے وسائل اس میں لگا رہے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مچھروں کو چھان رہے ہیں، ہاتھیوں کی فکر نہیں جو کھیت روندتے چلے جا رہے ہیں۔

محمد طاہر ہاشمی، دھیرکوٹ

تحریک نسواں۔ ایک مطالعہ (اکتوبر ۹۶) اس موضوع پر اس سے قبل شائع ہونے والے مضامین کے مقابلے میں متنوع تھا، اچھا تھا لیکن مضمون میں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ وقت کی ضرورت اس موضوع پر سیر حاصل اور جامع مضمون ہے۔

عفیفہ اطہر، گنڈو پیران

رسول پاکؐ کے مزاج میں مزاح شستہ کو بھی تو دخل تھا۔ آپ کے تو سب مضامین ہی سنجیدہ ہوتے ہیں۔ آپ کا اسلوب بھی اتنا آسان تھا کہ حضرت ابوبکرؓ سے لے کر ایک عام گڈریا بھی مزے سے سنتا تھا۔ آپ بھی اس سے سبق لیں۔

محمد نوید اقبال، بہاولنگر

مشکل الفاظ کو تبدیل کرنے کے بجائے ایک حل ہو سکتا ہے کہ بریکٹ میں مترادف (ہم معنی) لفظ لکھ دیا جائے۔

جماعت اسلامی پاکستان کے مرکزی دفاتر، منصورہ کے نئے فون نمبر

فیکس نمبر

042-7832194

042-5419520-24

042-7844605-09

سالانہ خریداروں اور ایجنسی ہولڈروں سے گزارش ہے کہ خط و کتابت میں خریداری / ایجنسی نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ (منیجر)

بیرونِ ممالک ترجمان القرآن حاصل کرنے کے لیے رابطہ پتے:

MAKTABA KULLIAH ALHINSAH
JAMIATUL MALAE ABDUL AZIZ
P.O.BOX 9027 JIDDAH
SAUDI ARABIA

SAIFULLAH SANAI
P.O.BOX 9178
DAMMAM 31413
SAUDI ARABIA

ADAAB BOOK SHOP
P.O.BOX 287
MANAMA
BAHRAIN

ANAYAT HUSSAIN GHAURI
P.O.BOX 382
ABU DHABI
UAE

MANZOOR ILAHI
P.O,BOX 621
DUBAI
UAE.

MR.MUHAMMAD SALAHUDDIN
DARUL SAUDIA JAUHARIA
AL BAGHDADIA BUILDING
P.O.BOX 2043
JEDDAH-21451

UMER ABDUL AZIZ
755-EAST 9 STREET#.B.6.
BROOKLYN
NEW YORK-11230(U.S.A)
✆ (781)421-5428

ISLAMIC BOOK CENTER
120,DRUMMOND ST.
LONDON N.W.I 2HL
UK.

UK ISLAMIC MISSION
121,OAKLAND ROAD HANWELL
LONDON W7 2DT
UK.

UK ISLAMIC MISSION
401-403,ALUM ROCK ROAD
BIRMINGHAM B-8 3DT
UK.

UK ISLAMIC MISSION
19- CARRINGTON STREET
GLASGOW G4 9AJ
UK.

UK ISLAMIC MISSION
1 TYDFIL PALACE
ROTH PARK CARDIFF
SOUTH WALES UK.

SYED SHAUKAT ALI
DEPT. OF COMMUNICATIONS
INTL.ISL.UNI. P.O.BOX 70
JALANJAN 46700-PJ SELANGER
MALAYSIA

RAFAY SAMAN
423,BARA MUGH BAZAR
ELEPHANT ROAD DHAKA
BANGLA DESH

دیگر ملکوں میں بھی خواہشمند رابطہ کریں:

مینیجر ترجمان القرآن، ۵-اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور 54600 فون 042-7587916

حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵-اے ذیلدار پارک 'اچھرہ' لاہور سے شائع کیا

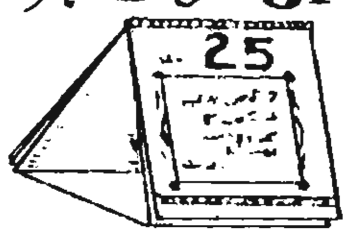
گفٹ سکیم تعارف

سمع و بصر
علی ہائٹس، ۹ کمرشل زون
کریم بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور
فون: 5411546
فیکس: 5419541

SAMA-O-BASAR
سمع و بصر

رمضان المبارک اور پھر عید کے موقع پر اپنے احباب اور ننھے بچوں کے لئے تحائف بھیجیں۔ ہر تحفے کے ساتھ ایک تہنیتی کارڈ بھی آپ کے پیغام کے ساتھ بھیجا جائے گا۔

سدا بہار کیلنڈر، پانچ رنگوں میں، پُروقار، دیدہ زیب طباعت
31 صفحات، ہر صفحہ پر اردو ترجمہ قرآن / حدیث
ترتیب: پروفیسر مسلم سجّاد
تدوین: پروفیسر عنایت علی خان
زرِ تعاون: 90 روپے

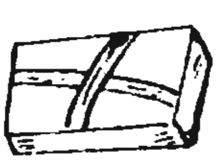




کتاب کہانی نمبر 1، ایک کیسٹ کے ساتھ 4 خوبصورت کتابیں
بچوں کے لیے نئے انداز میں نئی کوشش، لفظ بہ لفظ
دلنشیں انداز، پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ



زرِ تعاون 85 روپے



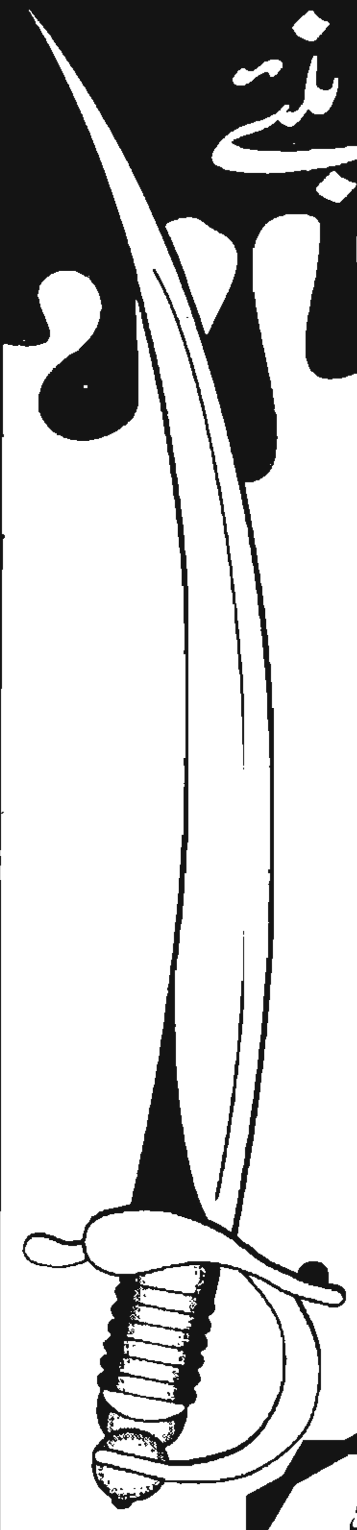
دس آڈیو کیسٹ، خوبصورت گفٹ پیک میں، پسند آپکی اپنی،
ہمیں صرف عنوانات بتا دیں، تحفہ بھی، تعلیم بھی۔ زرِ تعاون 225 روپے

VHS ویڈیو کیسٹ، نیشنل جاپان، گفٹ پیک میں، ہماری فہرست سے عنوان پسند کریں۔
تحفہ بھیجنے کا نیا انداز زرِ تعاون: 200 روپے

تفصیلات کے لئے رابطہ کیجیے:
زرِ تعاون بذریعہ بنک ڈرافٹ، منی آرڈر یا نقد وصول کیا جائے گا۔ چیک کی صورت میں چیک کیش ہونے پر تحفہ روانہ کیا جائے گا۔

REGD. NO. L 5340 PHONES : 7587916
7585590
MONTHLY **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE

شہدائے اسلام کے جانشین بنئے



پاکستانی نوجوانوں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اُمتِ مُسلمہ کی سرفرازی اور عظمت رفتہ کی بحالی کیلئے کشمیر، افغانستان، فلسطین، بوسنیا، اراکان، چیچنیا اور تاجکستان کے ہراول دستوں میں شامل ہو کر اپنی جانیں نچھاور کر رہے ہیں۔

آزادی کشمیر اور اسلامی بیداری کی لہر جس رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے۔ قافلہ شہداء میں اسی نسبت سے اضافہ ہو رہا ہے ان پاکباز سرفروش شہداء کے والدین، بہن بھائیوں اور بچوں کی کفالت، تعلیم و تربیت اور معاشرہ میں باعزت مقام و مرتبہ کے لیے منظم اور ہمہ گیر عملی امداد کی ضرورت وقت کا اہم تقاضا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جس نے اللہ کی راہ میں لڑنے والے غازی کو سازوسامان مہیا کیا وہ بھی غازی ہے اور غازی کے پیچھے اس کے اہل وعیال کیلئے اچھا جانشین بنا وہ بھی غازی ہے۔"

آیئے! کسی ایک گھرانے کے کفیل بن جایئے یا
ماہانہ یا سالانہ عطیات دیجئے۔
گھر کے ہر فرد اور دیگر احباب کو اس کارِ خیر میں حصہ لینے پر ابھاریئے

> اپنے عطیات بذریعہ چیک، ڈرافٹ، منی آرڈر یا نقد صورت میں براہ راست ارسال فرمائیں یا شہدائے اسلام فاؤنڈیشن اکاؤنٹ نمبر 1112-0001 بینک الحبیب لمیٹڈ عوامی کمپلیکس برانچ نیو گارڈن ٹاؤن لاہور میں جمع کرائیں۔

سرپرست اعلیٰ
سینیٹر قاضی حسین احمد

حافظ محمد ادریس چیئرمین شہدائے اسلام فاؤنڈیشن

66 - ایف ماڈل ٹاؤن لاہور فون نمبر 852421 - 042 فیکس 7832194 - 042